حیدرآباد R.N.I.No.APURD/2013/54302 ہفتہ روزہ

فلک نما نیوز

FALAKNUMA NEWS

FALAKNUMA NEWS

Urdu Weekly Hyderabad

Editor In Chief: MOHD ATHER RAHEEM

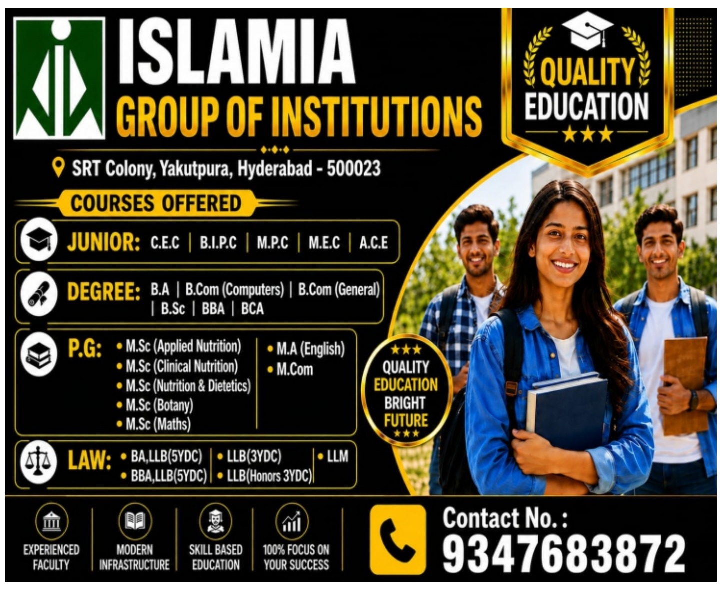

MONDAY 21 SEPTEMBER 2026 VOLUME:14 ISSUE :35 Rs.2.00 PAGES 4

پیر ۲۱ ستمبر ۲۰۲۶ء ۸ ربیع الآخر ۱۴۴۸ھ جلد (۱۴) شمارہ (۳۵) قیمت ایک روپیہ

تلنگانہ وکست بھارت 2047 کے نشانہ کو حاصل کرنے کیلئے کلیدی رول ادا کرنے کیلئے تیار

دہلی میں کانفرنس، وزیر فینانس ملو بھٹی وکرامارکا کا خطاب

شمس آباد۔ تلنگانہ کے نائب وزیراعلیٰ اور وزیر فینانس ملو بھٹی وکرامارکا نے کہا کہ تلنگانہ وکست بھارت 2047 کے ہدف کو حاصل کرنے میں کلیدی رول ادا کرنے کیلئے تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ تلنگانہ ملک کے متعین مہوا کانکشی اقتصادی اہداف کو دور کرنے کی خواہشات کے طور پر نہیں دیکھتا ہے بلکہ ایک فوری ذمہ داری کے طور پر ٹھوس کارروائی کی ضرورت ہے۔ نائب وزیراعلیٰ نے مرکزی مالیات اور کارپوریٹ امور کی وزیر نرملا سیتارمن کی قیادت میں ہفتہ کو نئی دہلی میں منعقدہ وکست بھارت کی طرف ہندوستان کے سفر کیلئے مالی وسائل کو متحرک کرنے کے موضوع پر کانفرنس سے خطاب کیا۔ کانفرنس میں مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزرائے خزانہ، مرکزی اور ریاستی مالیاتی محکموں کے سینئر افسران اور اقتصادی ماہرین نے شرکت کی۔ تلنگانہ سے نائب وزیراعلیٰ کے ساتھ محکمہ خزانہ اور منصوبہ بندی کے سکریٹری ڈاکٹر گورو اپل بھی تھے۔ بھٹی وکرامارکا نے کہا کہ بڑا چیلنج مالیاتی استحکام کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کی بے مثال سطح کو حاصل کرنے کیلئے درکار مالی وسائل کو متحرک کرنا تھا۔ پیداواری صلاحیت میں اضافہ اور اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ ترقی کے ثمرات ہر شہری اور ہر علاقے تک پہنچیں۔ انہوں نے کہا کہ وکست بھارت کی تعمیر کا ہدف مرکز یا ریاستیں آزادانہ طور پر حاصل نہیں کرسکتیں اور مرکز اور ریاستوں کو تعاون پر مبنی وفاقیت کے جذبے کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے باہمی تعاون پر مبنی مضبوط اداروں اور پالیسیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اور نجی دونوں وسائل کو متحرک کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ تلنگانہ صرف فنڈز حاصل کرنے کیلئے نہیں بلکہ ایک واضح ترقیاتی منصوبہ، مالی وسائل کو متحرک کرنے کیلئے ایک متعین حکمت عملی اور طویل مدتی وژن کے ساتھ بحث میں حصہ لے رہا ہے۔ نائب وزیراعلیٰ نے کہا کہ تلنگانہ مضبوط اقتصادی بنیادوں کے ساتھ ترقی کے اگلے مرحلہ کیلئے تیار ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریاست کی مجموعی ریاستی گھریلو پیداوار 2025-26ء میں 17.82 لاکھ کروڑ تک پہنچ گئی۔ موجودہ قیمتوں پر 10.7 فیصد اضافہ درج کیا گیا۔ مستقل قیمتوں پر حقیقی جی ایس ڈی پی نمو کا تخمینہ 8.5 فیصد لگایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ تلنگانہ کی فی کس آمدنی بڑھ کر 4,18,931 روپئے ہوگئی ہے جو کہ 2,19,575 کی قومی اسط سے تقریباً دوگنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ خدمات کے شعبے میں 13.5 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا جبکہ ثانوی شعبے میں 9.4 فیصد اضافہ ہوا۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ ترقی کی رفتار پر تلنگانہ کی معیشت 2047ء تک 1.21 ڈالر ٹریلین تک پہنچنے کا تخمینہ ہے۔ تاہم ریاستی حکومت نے 2047ء تک تلنگانہ کو تین ٹریلین ڈالر کی معیشت میں تبدیل کرنے کا بہت زیادہ مہتوا کانکشی ہدف مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا مقصد قومی معیشت میں تلنگانہ کا حصہ تقریباً پانچ فیصد سے بڑھ کر 10 فیصد کرنا ہے۔ بھٹی وکرامارکا نے کہا کہ تین ٹریلین ڈالر کی معیشت کی تعمیر کیلئے تلنگانہ کو بنیادی ڈھانچے کی مالی اعانت کے طریقے کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ تلنگانہ ایک ایسے ماڈل کی طرف بڑھ رہا ہے جو سرکاری وسائل کو حکمت عملی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے نجی سرمایہ کاری، ادارہ جاتی فنڈز اور خودمختار فنڈز سے بڑی سرمایہ کاری کو متحرک کرے گا

برتھ اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بنوانے والوں کے لئے بڑی خبر یکم اکٹوبر سے رجسٹریشن کے طریقہ کار میں اہم تبدیلی

حیدرآباد پیدائش کے وقت برتھ سرٹیفکیٹ اور موت کے وقت ڈیتھ سرٹیفکیٹ انتہائی اہم دستاویزات ہیں۔ بچوں کے لیے برتھ سرٹیفکیٹ ان کی پہلی شناختی دستاویز بھی ہوتا ہے، جو اسکول میں داخلے اور سرکاری سہولتوں سے استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی اہم ہے، کیونکہ اس کی مدد سے افراد خاندان بینک اکاو?نٹس، جائیداد اور دیگر قانونی حقوق کے دعوے کرسکتے ہیں۔ رجسٹریشن ا?ف برتھس اینڈ ڈیتھس (ترمیمی) ایکٹ رواں سال یکم اکتوبر سے نافذ العمل ہوگا۔ رجسٹرار جنرل ا?ف انڈیا مریتیو نجے کمار نارائن نے بتایا کہ نئے قانون کی وہ دفعات بھی یکم اکتوبر سے نافذ ہوجائیں گی جن کے تحت پیدائش اور اموات کے تاخیر سے اندراج کے قواعد مزید سخت کردیئے گئے ہیں۔ نئے قوانین کا بنیادی مقصد ان افراد پر توجہ دینا ہے جو پیدائش یا موت کا اندراج مقررہ مدت گزرنے کے بعد کراتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص معمول کی مدت گزرنے کے بعد برتھ یا ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے لیے درخواست دیتا ہے تو اس پر نئے قواعد لاگو ہوں گے۔ نئے قواعد کے مطابق اگر کسی پیدائش یا موت کے واقعہ کے ایک سال سے زیادہ لیکن دو سال کے اندر اندراج کرایا جاتا ہے تو ضلع مجسٹریٹ، سب ڈویژنل مجسٹریٹ یا ضلع مجسٹریٹ کی جانب سے مجاز ایگزیکٹیو مجسٹریٹ کی منظوری لازمی ہوگی۔ اس کے ساتھ متعلقہ معاملے کی تصدیق بھی کی جائے گی اور مقررہ فیس ادا کرنا ہوگی۔ اگر پیدائش یا موت کے اندراج میں دو سال سے زیادہ تاخیر ہوجائے تو قواعد مزید سخت ہوجائیں گے۔ ایسی صورت میں اندراج صرف فرسٹ کلاس جوڈیشل مجسٹریٹ کے حکم پر ہی کیا جاسکے گا۔ یعنی دو سال سے زیادہ تاخیر کی صورت میں درخواست گزار کو عدالتی کارروائی سے گزرنا ہوگا۔ حکومت کے مطابق ان تبدیلیوں کا مقصد پیدائش اور اموات کے ریکارڈ کو زیادہ درست، شفاف اور بروقت بنانا ہے۔ رجسٹریشن ا?ف برتھس اینڈ ڈیتھس (ترمیمی) بل 2026 کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے منظور کیا تھا اور صدر کی منظوری کے بعد گزشتہ ماہ یہ قانون بن گیا۔ اس قانون کا مقصد پیدائش اور اموات کے اندراج میں ہونے والی تاخیر کو روکنا اور عوام کو مقررہ وقت کے اندر رجسٹریشن کرانے کی ترغیب دینا ہے۔ قانون کے مطابق اگر کسی پیدائش یا موت کی اطلاع رجسٹرار کو ایک سال سے زیادہ لیکن دو سال کے اندر دی جاتی ہے تو اس کا اندراج ضلع مجسٹریٹ، سب ڈویژنل مجسٹریٹ یا مجاز ایگزیکیٹو مجسٹریٹ کی منظوری سے ہی کیا جاسکے گا۔ اسی طرح اگر پیدائش یا موت کی اطلاع دو سال سے زیادہ عرصے کے بعد دی جائے تو اندراج صرف فرسٹ کلاس جوڈیشل مجسٹریٹ کے حکم پر ہوگا۔ تاخیر سے رجسٹریشن کی اجازت دینے سے پہلے متعلقہ مجاز افسر کو پیدائش یا موت کی اطلاع کی صداقت کی تصدیق بھی کرنا ہوگی۔ پیدائش اور موت کا اندراج لازمی قرار دیا گیا ہے اور جاری کیا جانے والا سرٹیفکیٹ کسی فرد کی قانونی شناخت کے لئے اہم دستاویز تصور ہوتا ہے

وبائی بخار اور ڈینگو کے مریضوں میں مسلسل اضافہ مچھروں کی کثرت اور موسمی تبدیلی سے امراض کا پھیلاؤ

شہر میں وبائی بخار اور ڈینگو کے مریضوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ریکارڈ کیا جانے لگا ہے اور کہا جارہا ہے کہ اگر موسم میں تبدیلی رونما ہوتی ہے تو ایسی صورت میں وبائی امراض کا شکار افراد کی تعداد میں مزید اضافہ ریکارڈ کیا جائے گا۔ دونوں شہروں کے سرکاری دواخانوں کے علاوہ خانگی دواخانوں میں مریضوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ریکارڈ کیا جارہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ موسمی تبدیلیوں کے نتیجہ میں پھیلنے والے امراض کے علاوہ مچھروں کی کثرت کے سبب وبائی امراض کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ریکارڈ کیا جانے لگا ہے۔ ماہر اطباء کا کہنا ہے کہ موسمی تبدیلیوں کے نتیجہ میں پھیلنے والے بخار و امراض کو روکنا دشوار ہے کیونکہ انسان کی قوت مدافعت پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سرکاری دواخانوں میں بھی وبائی امراض کے شکار مریضوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ ریکارڈ کیا جارہا ہے اور ڈاکٹرس مریضوں کی تعداد میں ہونے والے اضافہ کو دیکھتے ہوئے ڈینگو کے معائنوں کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ ڈاکٹرس کا کہنا ہے کہ اگر وائرل فیور اور ڈینگو کے درمیان فرق جاننا ہے تو مریضوں کو ڈینگو کا معائنہ کروانا چاہئے کیونکہ وبائی امراض کے دوران جو شکایات ہوتی ہیں اسی طرح کی شکایات ڈینگو میں بھی ہوتی ہیں۔ بچوں اور ضعیف العمر افراد جن کی قوت مدافعت کمزور ہوتی ہے انہیں ڈینگو اور وبائی امراض سے محفوظ رہنے کے لئے مقوی اور صحت بخش غذاء کے استعمال پر توجہ دینے کے علاوہ مسلسل بخار یا کھانسی اور سردی کی صورت میں معائنہ کرواتے ہوئے علاج کروانا چاہئے کیونکہ معصوم بچوں میں ڈینگو سے زیادہ ٹائیفڈ کا مرض پایا جانے لگا ہے اور اس کے لئے بچوں کی مسلسل نگہداشت کے ذریعہ علاج ناگزیر ہوتا ہے۔ دونوں شہروں میں موسمی تبدیلیوں کے اثرات کے سلسلہ میں مجلس بلدیہ عظیم تر حیدرا?باد کی جانب سے چلائی جانے والی شعور بیداری مہم کے دوران کچھرے کی نکاسی کے علاوہ صفائی کو یقینی بنانے کے اقدامات کئے جارہے ہیں اس کے ساتھ عوام سے اپیل کی جارہی ہے وہ اپنے ا?س پاس کے ماحول کی صفائی کو یقینی بنانے کے ساتھ ساتھ جمع پانی کو صاف کرنے کے خصوصی اقدامات کریں تاکہ مچھروں کی افزائش کے مراکز کو ختم کیا جاسکے۔ سردی، سردرد، بخار، کھانسی، نزلہ اور زکام کے علاوہ اعضاء شکنی کے ساتھ دواخانوں سے رجوع ہونے والے مریضوں کو ڈاکٹرس مشورہ دے رہے ہیں کہ اگر 4 تا 5 یوم میں ان امراض سے شفاء نہیں ملتی ہے تو ایسی صورت میں وہ روایتی علاج کے بجائے معائنہ کرواتے ہوئے تشخیص کو یقینی بنائیں

مہیش کمار گوڑ کا پلٹ وار۔ ہائیکورٹ کا فیصلہ بی آر ایس کے منہ پر طمانچہ

خیرت آباد ضمنی انتخاب کیلئے کانگریس پوری طرح تیار

حیدرآباد۔ صدر تلنگانہ پردیش کانگریس کمیٹی مہیش کمار گوڑ نے خیرت آباد کے رکن اسمبلی ڈی ناگیندر کی نااہلی سے متعلق کیس میں تلنگانہ ہائیکورٹ کے فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے۔ انہوں نے آج میڈیا سے بات چیت کرتے ہوئے اپوزیشن کے تمام الزامات کو مسترد کردیا اور تبصرہ کیا کہ یہ فیصلہ کانگریس حکومت کے منہ پر طمانچہ ہرگز نہیں ہے بلکہ انحراف کے سیاست کی بنیاد رکھنے والی اپوزیشن بی آر ایس کیلئے ایک زوردار قانونی و سیاسی طمانچہ ہے۔ مہیش کمار گوڑ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس کے دور اقتدار میں کوئی بھی انحراف نہیں ہوا ہے۔ مختلف اراکین اسمبلی محض اس لئے حکومت کی حمایت کررہے ہیں کیونکہ وہ کانگریس پارٹی کی عوامی طرز حکمرانی اور ریاست بھر میں جاری فلاحی و ترقیاتی پروگرامس سے متاثر ہیں۔ انہوں نے ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ تلنگانہ میں پارٹی انحراف کے کلچر اور روایت کی شروعات خود بی آر ایس نے کی تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ ماضی میں کانگریس کے ٹکٹ پر جیتنے والے ارکان اسمبلی کو کس طرح بی آر ایس میں ضم کیا گیا۔ ایسی بے قاعدگیوں کے مرتکب بی آر ایس کے قائدین اب اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں جو انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ صدر تلنگانہ پردیش کانگریس کمیٹی نے اعتماد کا اظہار کیا ہیکہ اگر اسمبلی حلقہ خیرت آباد کا ضمنی انتخاب منعقد ہوتا ہے تو کانگریس پارٹی اس کا سامنا کرنے کیلئے پوری طرح تیار ہے۔ مہیش کمار گوڑ نے کہا کہ ڈی ناگیندر دوبارہ اسمبلی حلقہ خیرت آباد سے انتخاب لڑیں گے یا نہیں اس کا قطعی فیصلہ کانگریس پارٹی ہائی کمان تمام پہلوؤں کی جانچ کے بعد کرے گی۔ انہوں نے زور دیا کہ کانگریس حکومت نے ہمیشہ دستوری حدود اور عوامی فلاح کو اپنا مقصد بنا کر کام کیا ہے۔ اگر ضمنی انتخاب منعقد ہوا تو عوام ایک بار پھر کانگریس کے حق میں ہی فیصلہ سنائیں گے۔

سواپنل مہالنگے کا خصوصی انٹرویو

سینئر رپورٹر: عرفان جامی والا

سوال 1 (سینئر رپورٹر عرفان جامی والا): سواپنل جی، آپ کا سفر اشتہارات سے شروع ہوا، پھر تھیٹر اور آخرکار فلموں تک پہنچا۔ آپ اس تبدیلی کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب (سواپنل مہالنگے): اشتہارات نے مجھے الفاظ اور خیالات کی طاقت سکھائی۔ وہاں میں نے سیکھا کہ کم الفاظ میں بھی گہرائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ تھیٹر نے مجھے جذبات کو جینا اور براہِ راست ناظرین سے جڑنا سکھایا۔ فلموں اور ٹیلی ویژن نے مجھے بڑے پیمانے پر کہانیاں بیان کرنے کا موقع دیا۔ یہ مسلسل سفر میری تخلیقی صلاحیتوں کو مزید گہرا کرتا ہے اور ہر میڈیم میں ایک مختلف نقط ? نظر اختیار کرنے کی تحریک دیتا ہے۔

سوال 2: شور کی آلودگی پر ڈاکیومنٹری بنانے کا خیال آپ کے ذہن میں کب آیا؟

جواب: جب مجھے محسوس ہوا کہ شہری زندگی میں شور معمول بن چکا ہے اور لوگ اسے مسئلہ سمجھنا بھی چھوڑ چکے ہیں، تو مجھے لگا کہ اس موضوع پر سنجیدہ گفتگو ہونی چاہیے۔ تہواروں، تعمیراتی کاموں اور ٹریفک کے شور نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ یہ صرف ماحولیاتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سماجی بحران بھی ہے۔ یہیں سے اس ڈاکیومنٹری کا خیال پیدا ہوا۔

سوال 3: اس ڈاکیومنٹری میں کس طرح کی تحقیق شامل کی جائے گی؟

جواب: ہم نے ماہرینِ ماحولیات، ڈاکٹروں اور ماہرینِ عمرانیات سے بات چیت کی ہے۔ اس میں کام کرنے والے افراد، طلبہ اور بزرگوں کی حقیقی زندگی کی کہانیاں بھی شامل ہوں گی، جن کی زندگی شور سے متاثر ہوتی ہے۔ تحقیق میں قانونی پہلوؤں اور ثقافتی اثرات کو بھی شامل کیا جائے گا، تاکہ ناظرین اس مسئلے کو ہر زاویے سے سمجھ سکیں۔

سوال 4: کیا آپ اس میں قانونی پہلوؤں کو بھی اجاگر کریں گے؟

جواب: بالکل۔ ہندوستان میں شور کی آلودگی سے متعلق قوانین موجود ہیں، لیکن ان کا مؤثر نفاذ ہمیشہ نہیں ہو پاتا۔ ڈاکیومنٹری یہ دکھائے گی کہ قوانین اور ضوابط پر صحیح طریقے سے عمل درآمد معاشرے کو راحت فراہم کرسکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے گا کہ قوانین کو مؤثر بنانے میں شہری بیداری اور عوامی شرکت کتنی اہم ہے۔

سوال 5: تکنیکی اعتبار سے فلم کو کس انداز میں پیش کیا جائے گا؟

جواب: ہم ایسے امیرسیو ویژولز استعمال کریں گے جن سے ناظرین کو محسوس ہو کہ وہ خود شور سے بھرے ماحول میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ماہرین کی آرا اور حقیقی زندگی کی کہانیوں کو بصری انداز میں پیش کیا جائے گا۔ اس سے مسئلے کی سنگینی براہِ راست محسوس ہوگی اور ناظرین جذباتی طور پر اس سے جڑ سکیں گے۔

سوال 6: آپ کے خیال میں شور کی آلودگی ذہنی صحت کو سب سے زیادہ کس طرح متاثر کرتی ہے؟

جواب: مسلسل شور تناؤ میں اضافہ کرتا ہے، نیند میں خلل ڈالتا ہے اور کام کرنے کی صلاحیت کو متاثر کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ذہنی توازن پر بھی اثر ڈال سکتا ہے۔ انسان چڑچڑا ہوسکتا ہے، توجہ مرکوز کرنے میں دشواری ہوسکتی ہے اور سماجی تعلقات بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ اسی لیے اسے صرف ماحولیاتی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی مسئلہ بھی سمجھنا چاہیے۔

سوال 7: کیا فلم میں ثقافتی پہلوؤں کو بھی شامل کیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں، کیونکہ شور صرف صحت کو ہی متاثر نہیں کرتا بلکہ ثقافتی مقامات کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مندر، تھیٹر اور کتب خانے جیسے مقامات میں سکون اور خاموشی ضروری ہوتی ہے، لیکن شہری شور وہاں بھی خلل پیدا کرتا ہے۔ فلم یہ دکھائے گی کہ اس آلودگی کا ہماری ثقافتی وراثت پر بھی اثر پڑتا ہے۔

سوال 8: اس فلم سے ناظرین کیا سیکھیں گے؟

جواب: یہ فلم صرف مسئلہ دکھانے کے لیے نہیں بلکہ حل کے لیے لوگوں کو متحرک کرنے کے مقصد سے بنائی جارہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اجتماعی ذمہ داری کو سمجھیں اور چھوٹے چھوٹے اقدامات کریں — مثلاً تہواروں میں آواز کی شدت کو محدود رکھنا اور تعمیراتی کاموں میں قواعد پر عمل کرنا۔ یہ سیکھ لوگوں کو اپنی زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے تحریک دے گی۔

سوال 9: فلمی صنعت اور معاشرہ اس اقدام کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے؟

جواب: فلمی صنعت اسے عوامی صحت کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کی سمت میں ایک اہم قدم سمجھتی ہے۔ معاشرے کے لوگ بھی اس کے بارے میں پُرجوش ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ فلم انہیں روزمرہ کے مسائل کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا موقع دے گی۔ مجھے خوشی ہے کہ میری اس کوشش کو مثبت انداز میں دیکھا جارہا ہے۔

سوال 10: اس ڈاکیومنٹری کی شوٹنگ کہاں کی جائے گی؟

جواب: شوٹنگ بنیادی طور پر ممبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں کی جائے گی۔ وہاں کے ٹریفک، تعمیراتی کاموں اور تہواروں کے مناظر کے ذریعے حقیقی صورتِ حال پیش کی جائے گی۔ تقابل کو واضح کرنے کے لیے دیہی علاقوں کی کچھ مثالیں بھی شامل کی جائیں گی۔

سوال 11: کیا اس میں بین الاقوامی نقط ? نظر بھی شامل کیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں، کیونکہ شور کی آلودگی صرف ہندوستان کا مسئلہ نہیں ہے۔ دنیا کے کئی بڑے شہر بھی اس مسئلے سے دوچار ہیں۔ ہم بین الاقوامی ماہرین کی آرا اور کچھ غیر ملکی مثالیں شامل کریں گے، تاکہ ناظرین سمجھ سکیں کہ یہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔

سوال 12: اس فلم کے ہدفی ناظرین کون ہوں گے؟

جواب: یہ فلم سب کے لیے ہے — طلبہ، کام کرنے والے افراد، بزرگوں اور پالیسی بنانے والوں کے لیے۔ میرا مقصد ہے کہ فلم دیکھنے کے بعد ہر شخص اپنی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے متاثر ہو۔

سوال 13: کیا فلم میں حل بھی تجویز کیے جائیں گے؟

جواب: یقیناً۔ فلم میں اجتماعی اقدامات، قوانین کے مؤثر نفاذ اور ذاتی ذمہ داری پر زور دیا جائے گا۔ مثال کے طور پر تہواروں میں آواز پر کنٹرول، تعمیراتی کاموں کے لیے مقررہ اوقات کی پابندی اور انفرادی سطح پر شور کم کرنے والی عادات اپنانا۔

سوال 14: فلم کا انداز کیسا ہوگا — ڈاکیومنٹری یا ڈرامائی پیشکش؟

جواب: یہ ایک ڈاکیومنٹری ہوگی، لیکن اس میں ڈرامائی عناصر بھی شامل ہوں گے۔ حقیقی زندگی کی کہانیوں کو جذباتی انداز میں پیش کیا جائے گا، تاکہ ناظرین ان سے آسانی سے جڑ سکیں۔

سوال 15: کیا اس میں موسیقی کا استعمال کیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں، لیکن بہت سوچ سمجھ کر۔ ہم یہ دکھائیں گے کہ سریلی اور مدھر موسیقی ذہنی سکون فراہم کرتی ہے، جبکہ بے قابو شور ذہنی تناؤ میں اضافہ کرسکتا ہے۔ یہ تضاد ناظرین پر گہرا اثر ڈال سکتا ہے۔

سوال 16: فلم کا دورانیہ کتنا ہوگا؟

جواب: تقریباً 60 سے 90 منٹ۔ اس دورانیے سے موضوع کو تفصیل سے سمجھانے اور ناظرین کی دلچسپی برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔

سوال 17: کیا اسے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر بھی ریلیز کیا جائے گا؟

جواب: جی ہاں۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے فلم کو وسیع ناظرین تک پہنچانا ممکن ہوگا۔ ٹی وی اور تھیٹر کے ساتھ ساتھ اسے آن لائن اسٹریمنگ کے لیے بھی دستیاب کرانے کا منصوبہ ہے۔

سوال 18: اس فلم سے آپ کی ذاتی توقعات کیا ہیں؟

جواب: میری توقع ہے کہ لوگ فلم دیکھیں، اس پر غور کریں اور عملی قدم اٹھائیں۔ اگر ایک شخص بھی شور کم کرنے کی پہل کرتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہوگیا۔

سوال 19: کیا مستقبل میں آپ دیگر سماجی مسائل پر بھی کام کریں گے؟

جواب: جی ہاں۔ میرا مقصد تخلیقی کہانیوں کے ذریعے معاشرے میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ شور کی آلودگی کے بعد میں دیگر ماحولیاتی اور سماجی مسائل پر بھی کام کرنا چاہتا ہوں۔

سوال 20 (سینئر رپورٹر عرفان جامی والا): آخر میں، اس ڈاکیومنٹری سے آپ کی ذاتی امید کیا ہے؟

جواب: میری امید ہے کہ یہ فلم صرف پردے تک محدود نہ رہے بلکہ لوگوں کے دل و دماغ میں جگہ بنائے۔ اگر ایک شخص بھی شور کم کرنے کی پہل کرتا ہے تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد کامیاب ہوگیا۔

پیرانِ پیرؒ کی حقیقی میراث انسانی کردار کی اصلاح میں مضمر

پروفیسر ابو زاھد شاہ سید وحید اللہ حسینی

آج مسلمانوں کی اکثریت قطب ربانی، محبوب یزدانی، غوثِ اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (470-561/1077-1166) سے اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے نہایت اہتمام اور احترام کے ساتھ گیارہویں شریف کا انعقاد کرتی ہے۔ اس موقع پر ایصالِ ثواب، ذکر وفاتحہ اور بلاتفریق مذہب وملت عوام الناس بالخصوص غرباء و مساکین کی ضیافت کا اہتمام ایک نہایت محمود اور قابل تحسین عمل ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ پوری دنیا میں لاکھوں کروڑوں نادار و مستحق، یتیم وبیسر افراد کو عزت و وقار کے ساتھ کھانا میسر آتا ہے اور مواسات، سخاوت اور انسانی ہمدردی جیسے اوصاف کو فروغ ملتا ہے۔ قرآن مجید نیک لوگوں کی صفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں اور اس کے بدلے کسی جزا یا شکریے کے طالب نہیں ہوتے۔ تاہم اگر عقیدت کا یہ اظہار محض ایک رسمی تقریب یا سالانہ رسم تک محدود ہوجائے تو اس کی روحانی معنویت اپنے حقیقی مقصود تک نہیں پہنچ پاتی۔ چونکہ اس عمل کی روحانی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب ایک روز یا ایک مہینہ کی ضیافت مستقل خدمت خلق اور حاجت روائی کے جذبے میں تبدیل ہوجائے۔ رسول رحمتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالی تمہاری صورتوں اور مال کو نہیں، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ اس حدیث پاک سے واضح ہوتا ہے کہ دینی اعمال کی حقیقی قدر ان کے قلبی اخلاص اور عملی اثرات سے متعین ہوتی ہے نہ کہ وقتی جذبات سے انجام دیئے جانے والے اعمال سے۔ لہٰذا حضرت غوثِ اعظمؒ سے حقیقی محبت کا تقاضا صرف آپؒ کے نام پر محفل منعقد کرنے یا لنگر تقسیم کرنے تک محدود نہیں، بلکہ آپؒ کی روحانی میراث کو اپنی شخصیت اور عملی زندگی میں زندہ کرنا ہے۔ آپؒ کا سچا شیدائی وہ ہے جس کی زبان صدق وخیر خواہی کی مظہر، دل کینہ و حسد سے پاک، معاملات امانت ودیانت پر قائم، اور زندگی خدمتِ خلق، تواضع اور تقوی سے آراستہ ہو۔ اس اعتبار سے گیارہویں شریف کا ظاہری دسترخوان اگر محتاجوں کے جسم کو غذا فراہم کرتا ہے تو اس کی حقیقی روحانی معنویت یہ ہے کہ وہ انسان کے قلب میں اخلاص، نفس میں تزکیہ اور کردار میں صالحیت پیدا کرنے کا ذریعہ بنے۔ صوفیانہ روایت میں اولیائے کرام سے حقیقی محبت محض جذباتی وابستگی یا رسمی عقیدت نہیں، بلکہ ان کی تعلیمات کو اپنی عملی و اخلاقی زندگی میں اختیار کرنے کا نام ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روحانی تعلیمات کا بنیادی طریقہ کار تزکیہ نفس، تصفیہ قلب، مجاہدۂ نفس، اخلاص، توکل، صبر، رضا، تقوی اور اصلاحِ اخلاق پر استوار ہے۔ فتوح الغیب کے مختلف مباحث میں آپؒ قلب کی اصلاح، خواہشات پر ضبط، حکمِ الٰہی کے سامنے تسلیم ورضا، خوف ورجا اور توکل کو سلوک الی اللہ کے اہم مراحل کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس منہج کا مقصد انسان کے باطن کو پاکیزہ کر کے اس کے ظاہر و کردار کو شریعت، تقوی اور حسن اخلاق کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ چنانچہ گیارہویں شریف کو محض ایک رسمی اجتماع کے بجائے رسم سے حقیقت، عقیدت سے اتباع، ذکر سے فکر اور محبت سے کردار سازی کی طرف رہنمائی کرنے والے ایک روحانی موقع کے طور پر سمجھنا زیادہ بامعنی ہے۔ حضرت پیرانِ پیرؒ کی علمی شخصیت کی رفعت وعظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ آپؒ کو محض ایک صوفی بزرگ کے طور پر نہیں بلکہ فقیہ، محدث، واعظ اور روحانی مربی کی جامع حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ آپؒ کی تصانیف میں شریعت کی پابندی، عقیدے کی صحت، عبادات کی اصلاح، اخلاقی تربیت اور باطنی تزکیے کو باہم مربوط کیا گیا ہے۔ ایسے عظیم روحانی ہستی کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے پاکیزہ اثرات انسان کے باطن کی اصلاح، اخلاق کی تہذیب اور مخلوق خدا کے ساتھ خیر ورحمت کے عملی رویے میں جلوہ گر ہو۔ یہی وہ جامع منہج ہے جس میں شریعت وطریقت، ظاہر وباطن، عبادت واخلاق اور فرد ومعاشرہ کے درمیان متوازن اور مضبوط ربط قائم ہوتا ہے۔ زیرِ نظر مضمون کا بنیادی مقصد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات کی عصری معنویت کا تعین کرتے ہوئے یہ واضح کرنا ہے کہ آپؒ کا روحانی واخلاقی اسلوب تربیت عصر حاضر کے فرد اور معاشرے کو درپیش روحانی زوال، اخلاقی بحران، مادی غلبے، نفسانی خواہشات، خودغرضی اور باطنی اضطراب کے تدارک کے لیے کس نوع کی فکری، اخلاقی اور عملی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہورہا ہے ترجمہ: اور اے مومنو! تم سب اللہ کے حضور توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اسی لیے تخلیہ باطن یعنی کبر، حسد، بغض، ریا، حرص اور حبِ جاہ سے نجات اور تحلیہ یعنی اخلاص، تواضع، صبر، شکر، رحمت، ایثار اور حسنِ اخلاق سے آراستگی کو روحانی تربیت کے بنیادی مراحل قرار دیئے جاتے ہیں۔ محسن انسانیتؐ کا کثرت سے استغفار فرمانا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ روحانی کمال انسان کو خود پسندی میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ اسے اپنی محتاجی اور اللہ کی رحمت کا زیادہ احساس دلاتا ہے۔ روحانی انسان وہ نہیں جو اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگے، بلکہ وہ ہے جو اپنے عیوب کو پہنچانے، اللہ تعالی سے مغفرت طلب کرے اور اپنے کردار کی اصلاح جاری رکھے۔ یہ تعلیم عصر حاضر میں خاص اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ موجودہ تہذیب خوداحتسابی کے بجائے خودنمائی، شہرت اور ظاہری کامیابی کو فروغ دیتی ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا تصور تزکیہ نفس انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ دوسروں کی نظر میں اپنی قدر جانچنے سے پہلے اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ کی نظر میں اس کی حقیقت کیا ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی دعوت وتعلیم بھی محض خانقاہی گوشہ نشینی تک محدود نہیں تھی، بغداد میں آپؒ کی علمی و وعظی سرگرمیوں نے مختلف طبقات کو متاثر کیا اور آپؒ کے تعلیمی وروحانی مرکز سے علماء، صلحاء اور اولیاء کے علاوہ عام لوگوں اور طلبہ نے بھی استفادہ کیا۔ اس سے ایک بنیادی اصول سامنے آتا ہے کہ حقیقی تزکیہ قلب انسان کو معاشرے سے بے نیاز نہیں کرتا بلکہ اسے معاشرے کے لیے زیادہ نافع بناتا ہے۔ آج کے دور میں روحانیت کا یہی پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے کہ وہ انسان کو ظلم، فساد، استحصال اور بے حسی کے خلاف کھڑا کرے اور ضرورت مندوں کی مدد پر آمادہ کرے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات میں ذکر محض زبان کی حرکت نہیں بلکہ قلبی بیداری کا ذریعہ ہے۔ اگر زبان ذکر کرتی رہے لیکن انسان جھوٹ، ظلم، تکبر اور خیانت میں مبتلا ہو تو ذکر کی حقیقی روح ابھی اس کے کردار میں ظاہر نہیں ہوئی۔ جب انسان کثرت سے ذکر کرتا ہے تو اس کے اندر اللہ کا شعور پیدا ہوتا ہے، یہ شعور اسے تقوی یعنی اللہ سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ تقوی کے نتیجے میں انسان اپنے غصے، خواہشات اور جذبات پر قابو پانا سیکھتا ہے، جس سے اس کے اخلاق اور کردار میں بہتری آتی ہے پھر یہی بہتر کردار اسے نیک اور درست اعمال کی طرف لے جاتا ہے۔ یعنی ذکر زبان سے شروع ہوکر دل کی اصلاح، کردار کی پاکیزگی اور عمل کی درستگی تک پہنچتا ہے۔ یہ اصول ڈیجیٹل دور میں خاص اہمیت رکھتا ہے، جہاں انسان معلومات کے ہجوم میں گھرا ہوا ہے لیکن باطنی یکسوئی وصفائی سے محروم ہے۔ علاوہ ازیں فتوح الغیب کے ابتدائی مباحث میں آپؒ روحانی زندگی کی بنیاد احکام الٰہی کی پابندی، ممنوعات سے اجتناب اور تقدیر الٰہی پر رضا کو قرار دیتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپؒ کے نزدیک روحانیت محض نسبت یا دعوے کا نام نہیں، بلکہ عملی اطاعت اور اخلاقی انضباط سے عبارت ہے۔ فتوح الغیب کے دیگر مختلف مباحث میں نفس کے احوال، خواہشات اور دنیاوی وابستگیوں پر ضبط، قلب کی اصلاح اور اللہ تعالی کی قربت کو روحانی ارتقا کے اہم مراحل کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس تعلیم کی عصری معنویت اس لیے نمایاں ہے کہ جدید صارفیت انسان کی خواہشات کو لامحدود طلب، خودنمائی اور مادی حصول کی دوڑ میں تبدیل کررہی ہے، جبکہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اسلوب تربیت انسان کو خواہشات کا اسیر بننے کے بجائے اپنے نفس کا محاسب اور اپنے ارادے وخواہشات کا اخلاقی نگران بننے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح قلب کو غفلت، دنیاپرستی اور نفسانی اغراض سے پاک کرکے تعلق مع اللہ، قلبی سکون اور روحانی توازن پیدا کرنا موجودہ اضطراب اور باطنی بے سکونی کے مقابل ایک موثر روحانی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسی باطنی تربیت کے ضمن میں اخلاص، توکل، صبر، رضا اور تسلیم کو بنیادی اوصاف کی حیثیت حاصل ہے۔ اخلاص انسان کو ریا، شہرت اور نفسانی منفعت سے بلند کرکے رضائے الٰہی کی طرف متوجہ کرتا ہے، توکل اسے اسباب اختیار کرنے کے ساتھ نتائج اللہ تعالی کے سپرد کرنے کا شعور دیتا ہے، جبکہ صبر ورضا آزمائش، ناکامی اور ناموافق حالات میں روحانی استقامت اور خوداحتسابی پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا روحانی اسلوب تربیت جدید انسان کے خوف، عدمِ تحفظ اور مستقبل کے اضطراب کے مقابل ایک متوازن باطنی رویہ تشکیل دیتا ہے۔ تاہم اس باطنی اصلاح کی تکمیل اخلاقی کردار اور اجتماعی ذمہ داری میں ہوتی ہے۔ تزکیہ نفس کا حقیقی ثمر صدق، تقوی، تواضع، حسنِ سلوک، امانت، ایثار اور مخلوقِ خدا کے ساتھ خیر خواہی کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے تصوف انسان کو معاشرے سے الگ کرنے کے بجائے اسے صالح، ذمہ دار اور باکردار فرد بناتا ہے، چنانچہ خدمتِ خلق، خیر خواہی اور حسنِ معاملہ روحانی تربیت کے فطری نتائج قرار پاتے ہیں۔ یوں باطن کی اصلاح بالآخر کردار، معاملات اور اجتماعی زندگی کی اصلاح میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات کی عصری معنویت محض تاریخی صوفیانہ ورثے کی حفاظت میں نہیں، بلکہ انسان کے باطن کی اصلاح، کردار کی تشکیل اور معاشرے کی اخلاقی تعمیر میں مضمر ہے۔ یہی وہ جامع اسلوب تربیت ہے جس میں شریعت وطریقت، ظاہر و باطن، عبادت واخلاق اور فرد ومعاشرہ ایک متوازن وحدت کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ آخر میں اللہ تعالی سے دعا ہے کہ بطفیل نعلین پاک مصطفیؐ ہمیں قرآن اور صاحب قرآنؐ کی تعلیمات کے مزاج کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق رفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین طہٰ ویسین۔

اردو کے لیے دروازہ کب کھلے گا؟

تلو کو انتظامی شناخت ملی تو کرناٹک کی دوسری بڑی زبان کا سوال بھی زندہ ہوگیا

عبدالحلیم منصور

زبان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک قوم، ایک معاشرے اور ایک خطے کی تاریخ، تہذیب، یادداشت اور شناخت سانس لیتی ہے۔ اسی لیے کسی زبان کو سرکاری سطح پر جگہ ملنا صرف دفتری کارروائی کا معاملہ نہیں ہوتا؛ یہ محض زبان کے اعتراف کا نہیں، بلکہ اسے بولنے والے شہریوں کی ریاستی نظام تک مؤثر رسائی اور ان کی لسانی شناخت کے احترام کا سوال بھی ہے۔ کرناٹک میں اردو کے بارے میں بنیادی سوال بھی یہی ہے کہ جس زبان کو لاکھوں لوگ اپنی مادری زبان کہتے ہیں، جس کی یہاں صدیوں پرانی تہذیبی وادبی روایت ہے اور جس کے فروغ کے لیے ریاستی سطح پر باقاعدہ ادارہ بھی قائم ہے، اسے سرکاری کام کاج میں وہ قانونی مقام کب اور کیسے ملے گا جس کی گنجائش خود آئین فراہم کرتا ہے؟

18 ستمبر 2026 کو بنگلورو سے باہر پہلی مرتبہ منگلورو میں منعقدہ کرناٹک کابینہ کے اجلاس میں تلو کو دکشن کنڑ اور اڈپی اضلاع میں دوسری اضافی انتظامی زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت نے واضح کیا کہ یہ حیثیت انہی دونوں ساحلی اضلاع تک محدود ہوگی۔ یہ فیصلہ تلو بولنے والوں کے لیے ایک اہم لسانی پیش رفت ہے، لیکن اس کے ساتھ کرناٹک میں ایک دوسرا اور نہایت اہم سوال بھی پوری سنجیدگی سے سامنے آتا ہے: اگر کسی خطے میں بولی جانے والی زبان کو اس کی لسانی موجودگی، تاریخی اہمیت اور عوامی مطالبے کی بنیاد پر انتظامی نظام میں جگہ دی جاسکتی ہے تو اردو کے معاملے میں بھی اس کے آئینی اور قانونی امکانات پر سنجیدہ غور کیوں نہ کیا جائے؟ یہ سوال کسی جذباتی تقابل کا نہیں، ایک اصولی اور دستاویزی بحث کا تقاضا کرتا ہے۔

اس بحث کے پیچھے مردم شماری کے اعداد، آئین کی واضح دفعات، ریاستی قانون اور ملک کی دوسری ریاستوں کی باقاعدہ قانونی مثالیں موجود ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مادری زبان سے متعلق سرکاری اعداد وشمار کے مطابق کرناٹک میں اردو کو اپنی مادری زبان بتانے والوں کی تعداد تقریباً 66.18 لاکھ تھی، جو اس وقت کی ریاستی آبادی کا تقریباً 10.83 فیصد بنتی ہے۔ اسی مردم شماری میں تلو کو مادری زبان بتانے والوں کی تعداد تقریباً 15.93 لاکھ، یعنی تقریباً 2.61 فیصد درج ہوئی تھی۔ یہ اعداد کسی زبان کی تہذیبی عظمت یا ادبی قدر کا فیصلہ نہیں کرتے، لیکن یہ ضرور واضح کرتے ہیں کہ کرناٹک میں اردو کو محض ایک محدود لسانی گروہ کی زبان سمجھنا اعداد وشمار کی مکمل تصویر پیش نہیں کرتا۔ یہ مردم شماری کا سرکاری ریکارڈ ہے جو رجسٹرار جنرل ومردم شماری کمشنر، حکومت ہند کے تحت مرتب کیا گیا۔

کرناٹک کا موجودہ قانونی ڈھانچہ کنڑ کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیتا ہے۔ 1963 کے کرناٹک سرکاری زبان قانون میں کنڑ کو سرکاری زبان بنانے اور سرکاری مقاصد میں اس کے استعمال کا قانونی انتظام کیا گیا ہے۔ اسی قانون کا پس منظر بھی آئین کے آرٹیکل 345 سے وابستہ ہے۔ لہٰذا اردو کا مطالبہ کنڑ کی حیثیت کو چیلنج کرنے کے بجائے اس آئینی گنجائش کے استعمال کا مطالبہ ہے جس کے تحت ریاست ایک سے زیادہ زبانوں کو مخصوص سرکاری مقاصد کے لیے قانونی شناخت دے سکتی ہے۔

ملک میں اس کی واضح مثال تلنگانہ ہے۔ تلنگانہ کے سرکاری زبان کے قانون میں 2017 کی ترمیم کے ذریعے اردو کو پوری ریاست میں دوسری سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ آندھراپردیش میں بھی 2022 کی قانون سازی اور بعد کی سرکاری اطلاع کے ذریعے اردو کو ریاست کے تمام اضلاع میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ یہ مثالیں اس بات کی دلیل نہیں کہ کرناٹک کو لازماً وہی قانونی طریقہ اختیار کرنا ہوگا، بلکہ یہ ضرور دکھاتی ہیں کہ ہندوستانی وفاقی نظام میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا قانونی درجہ دینا کوئی غیر معمولی یا ناقابلِ تصور انتظام نہیں۔ خود سپریم کورٹ نے بھی 2025 کے ایک فیصلے میں یہ ریکارڈ کیا کہ کئی ریاستوں نے آئین کے آرٹیکل 345 کے تحت اردو کو سرکاری زبانوں میں شامل کیا ہے۔

اس معاملے کا ایک دلچسپ اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ تلو کے سرکاری درجہ کے لیے کرناٹک حکومت کی قائم کردہ مطالعہ ٹیم نے آندھراپردیش کا دورہ کرکے وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے لیے اختیار کیے گئے معیار اور طریق؟ کار کا جائزہ لیا تھا۔ 19 اور 20 جنوری 2026 کو ٹیم نے آندھراپردیش کا دورہ کیا تھا اور اس مطالعے کا مقصد مختلف ریاستوں میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانوں کے انتظام کا جائزہ لینا تھا۔ یہاں ایک فطری سوال پیدا ہوتا ہے: جب آندھراپردیش کے اردو ماڈل کا مطالعہ تلو کے انتظامی درجہ کے لیے کیا جاسکتا ہے تو کیا اسی تجربے کی روشنی میں کرناٹک میں اردو کی اپنی آئینی اور انتظامی حیثیت کا باقاعدہ جائزہ نہیں لیا جاسکتا؟

یہ سوال کسی جماعت کے حق یا مخالفت میں نہیں، بلکہ آئینی اصول کے یکساں اطلاق کا سوال ہے۔ تلو کو اس کے تاریخی اور جغرافیائی مرکز، یعنی دکشن کنڑ اور اڈپی میں انتظامی شناخت ملنا اپنی جگہ ایک لسانی پیش رفت ہے۔ اردو کا معاملہ بھی اس کی آبادی، تاریخی موجودگی، جغرافیائی پھیلاؤ اور انتظامی ضرورت کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ دونوں زبانوں کے مطالبات کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنا نہ ضروری ہے اور نہ مناسب۔ ایک زبان کو شناخت ملنے کا مطلب دوسری زبان کے مطالبے کو مسترد کرنا نہیں ہوتا۔ کنڑ کرناٹک کی بنیادی سرکاری زبان ہے اور ریاست کی غالب لسانی شناخت ہے، جبکہ اردو کے لیے مطالبہ کنڑ یا تلو کے خلاف نہیں بلکہ ایک اضافی لسانی شناخت اور ریاستی نظام تک بہتر انتظامی رسائی کا سوال ہے۔ کرناٹک کی کثیر لسانی حقیقت کو تسلیم کرنے کا مطلب یہی ہے کہ ایک زبان کی ترقی دوسری زبان کے جائز مطالبے کی نفی نہ بنے۔

اردو کرناٹک کے لیے نہ کوئی اجنبی زبان ہے اور نہ محض باہر سے آنے والی لسانی روایت۔ دکن کی سیاسی، تہذیبی اور ادبی تاریخ میں کرناٹک کا مقام بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ گلبرگہ، بیدر، بیجاپور اور رائچور جیسے خطے صدیوں سے اردو اور دکنی زبان وادب کے اہم مراکز رہے ہیں۔ بہمنی سلطنت اور بعدازاں عادل شاہی دور نے ان علاقوں میں اردو اور دکنی ادب کی پرورش کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا، جہاں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں نے اس زبان کی ابتدائی تشکیل وترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں اردو کی ادبی تاریخ کو صرف شمالی ہند تک محدود کرکے نہیں دیکھا جاسکتا؛ دکن، خصوصاً موجودہ کرناٹک کے خطے نے بھی اردو کی تشکیل، فروغ اور تہذیبی شناخت میں ایک مستقل اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں کرناٹک میں اردو کو محض ایک حالیہ شہری یا مہاجر زبان سمجھنا تاریخ کے ایک بڑے حصے کو نظرانداز کرنا ہوگا۔ اردو کی موجودگی صرف مردم شماری کے اعداد سے ثابت نہیں ہوتی؛ ریاست کے مختلف علاقوں کی تہذیبی اور ادبی تاریخ بھی اس کی گواہی دیتی ہے۔ ریاستی سطح پر اردو کی ادارہ جاتی موجودگی بھی نئی نہیں۔ کرناٹک اردو اکیڈمی یکم جون 1977 کو قائم کی گئی تھی۔ ابتدا میں یہ محکمہ کنڑ وثقافت کے لیے مشاورتی ادارے کے طور پر کام کرتی رہی، بعد میں اسے خودمختار ادارے کی حیثیت دی گئی اور 2011 میں محکمہ اقلیتی بہبود، حج واوقاف کے تحت منتقل کیا گیا۔ کرناٹک حکومت کی سالانہ رپورٹ میں اس کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے۔ یہ سب مل کر ایک اہم حقیقت سامنے لاتے ہیں: اردو کرناٹک میں محض بول چال کی زبان نہیں، بلکہ ایک تسلسل رکھنے والی تاریخی، تہذیبی، ادبی اور ادارہ جاتی حقیقت ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ اس حقیقت کا مناسب انتظامی اور قانونی اعتراف کب ہوگا؟ زبان کے حقوق کا مطلب کسی ایک زبان کو دوسری زبان کے مقابل کھڑا کرنا نہیں۔ کنڑ کی سرکاری حیثیت اپنی جگہ برقرار رہتے ہوئے اردو کے لیے آئینی گنجائش کے مطابق اضافی قانونی شناخت کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں کرناٹک کی مسلم قیادت، اردو صحافت، ادبی تنظیموں، اردو اکیڈمی اور اردو سے وابستہ سماجی اداروں کے کردار کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ اب تک اردو کے مختلف مسائل الگ الگ آوازوں میں اٹھتے رہے ہیں۔ سرکاری زبان کا مطالبہ، اگر واقعی ایک سنجیدہ اور مؤثر آئینی بحث بنانا ہے، تو اسے منتشر بیانات کے بجائے ایک واضح، مشترکہ اور دستاویزی مطالبے کی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ مسلم قیادت کے سامنے اصل سوال یہ نہیں کہ کون سا فرد یا کون سا گروہ اس مطالبے کی قیادت کرے؛ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اردو کے حق میں ایک متحد، غیر جماعتی اور آئینی موقف سامنے آتا ہے یا نہیں؟

ایک مشترکہ دستاویز میں مردم شماری کے اعداد، آئینی دفعات، کرناٹک کے قانونی ڈھانچے، تلنگانہ اور آندھراپردیش کی مثالیں، کرناٹک میں اردو کی تاریخی موجودگی اور ممکنہ انتظامی طریق کار کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ اسی بنیاد پر حکومت اور قانون ساز اداروں کے سامنے باقاعدہ نمائندگی، ماہرین سے مشاورت اور قانونی طریق؟ کار کے آغاز کا مطالبہ رکھا جاسکتا ہے۔ یہاں جذبات سے زیادہ تیاری کی ضرورت ہے۔ اگر اردو کے حق میں آواز صرف جلسوں، بیانات اور سماجی ذرائع ابلاغ تک محدود رہی تو اسے دیرپا قانونی مطالبے میں تبدیل کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن اگر مسلم عوامی نمائندے، اردو صحافی، ادیب، ماہرین قانون، دانشور اور متعلقہ ادارے ایک مشترکہ دستاویزی موقف تیار کریں، تو بحث کو ایک واضح آئینی سوال میں تبدیل کیا جاسکتا ہے: کیا کرناٹک میں اردو کو اس کی آبادی، تاریخی موجودگی اور آئینی گنجائش کے مطابق سرکاری مقاصد کے لیے مناسب قانونی شناخت دی جاسکتی ہے؟ یہ سوال کسی حکومت کے خلاف نعرہ نہیں؛ یہ حکومت کے سامنے ایک آئینی سوال ہے۔

اردو کی تاریخ کو صرف ماضی کی یادگار بنا دینا بھی اس زبان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ آج بھی اردو صحافت، ادب، ثقافت اور عوامی زندگی میں زندہ ہے۔ لیکن زندہ زبان اور سرکاری زبان میں فرق ہے۔ ایک زبان گھروں، بازاروں اور ادبی محفلوں میں زندہ رہ سکتی ہے، مگر جب تک اسے انتظامی نظام میں مناسب قانونی جگہ نہ ملے، اس کے بولنے والے شہری اور ریاست کے درمیان لسانی فاصلہ برقرار رہ سکتا ہے۔

فیض احمد فیض کی نظم "بول" کے معروف مصرعے اس بحث میں محض شعری آرائش نہیں بلکہ زبان، اظہار اور شناخت کی معنویت کی یاددہانی بن جاتے ہیں:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے

اردو کے سرکاری درجہ کا سوال بھی دراصل اسی زبان کی آزادی؟ اظہار سے آگے بڑھ کر ریاستی شناخت اور شہری رسائی کا سوال ہے۔ جو زبان لاکھوں شہریوں کے گھروں، بازاروں، صحافت، ادب اور تہذیبی زندگی میں موجود ہے، کیا ریاستی نظام میں بھی اسے اس کی موجودگی اور آئینی گنجائش کے مطابق جگہ مل سکتی ہے؟

زبان کسی سیاسی جماعت کی ملکیت نہیں ہوتی اور نہ کسی حکومت کا سیاسی احسان۔ اردو بولنے والے شہریوں کی تعداد، کرناٹک سے اس زبان کا تاریخی وتہذیبی رشتہ، اس کی موجودہ سماجی موجودگی اور آئینی گنجائش — یہ سب مل کر اردو کے سرکاری درجہ کے مطالبے کو ایک سنجیدہ عوامی اور آئینی مسئلہ بناتے ہیں۔ اس مطالبے کو کسی دوسری زبان کے خلاف کھڑا کرنے کے بجائے کرناٹک کی کثیر لسانی حقیقت کے ایک جائز حصے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ اب اصل امتحان اردو کے بولنے والوں کا نہیں، ان کی نمائندگی کرنے والوں کا ہے۔ مسلم قیادت، اردو اکیڈمی، اردو صحافت، ادبی وسماجی اداروں اور عوامی نمائندوں کو اس مسئلے کو محض تقریروں اور وقتی بیانات سے آگے لے جانا ہوگا۔ ایک متحد، غیر جماعتی اور دستاویزی مطالبہ تیار کرکے مردم شماری کے اعداد، آئینی دفعات، قانونی مثالوں اور عملی انتظامی تجاویز کے ساتھ حکومت کے سامنے رکھا جائے، اور حکومت سے اس پر واضح قانونی اور انتظامی اقدام کا مطالبہ کیا جائے۔ اردو کے نام پر آوازیں بہت ہیں؛ اب ضرورت ایسی مشترکہ آواز کی ہے جس کے پیچھے دلیل، دستاویز اور مسلسل پیروی موجود ہو۔

18 ستمبر کو تلو کو دکشن کنڑ اور اڈپی میں انتظامی شناخت مل گئی۔ یہ فیصلہ اپنی جگہ قابلِ احترام لسانی پیش رفت ہے، مگر اس نے کرناٹک میں اردو کے سوال کو بھی پہلے سے زیادہ نمایاں کردیا ہے۔ جب ایک زبان کے لیے اس کے انتظامی استعمال کا جائزہ لینے کی خاطر آندھراپردیش کے اردو تجربے کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے، جب تلنگانہ اور آندھراپردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا قانونی درجہ دیا جاچکا ہے، اور جب آئینِ ہند ریاست کو ایک سے زیادہ زبانوں کو سرکاری مقاصد کے لیے اختیار کرنے کی گنجائش دیتا ہے، تو کرناٹک میں اردو کے معاملے کو محض زیرِ بحث رکھنے کے بجائے اس پر باقاعدہ قانونی عمل شروع کرنے کا وقت بھی آچکا ہے۔ اردو کے لیے دروازہ کسی رعایت سے نہیں، آئینی راستے سے کھلنا چاہیے — اور اس دروازے پر دستک اب منتشر نہیں، متحد آواز میں ہونی چاہیے۔

گدھا: دنیا کا ذہین ترین وفادار جانور

(گدھے کی غیر معمولی صلاحیتیں: سائنس کے آئینے میں ایک نظر انداز مخلوق)

ڈاکٹر محمد عظیم الدین

یوکرین کے شہر چرنیہیو کے قریب واقع ایک دیہی فارم میں بولک اور بوشکا نامی دو گدھوں نے بغیر کسی بیرونی مدد کے بھیڑیوں اور لومڑیوں کے حملے ناکام بنا کر پورے ریوڑ کو محفوظ رکھا۔ یہ کوئی محض اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ گدھے کی اس فطری صلاحیت کا روشن ثبوت ہے جسے انسان صدیوں سے محض سست اور کم عقل سمجھتا آیا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق اب اس فرسودہ تصور کو یکسر بدل رہی ہے۔ گدھا دراصل قدرت کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں ذہانت، احساسِ تحفظ، وفاداری اور غیر معمولی قوت کا بے مثال امتزاج پایا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارِ؟ خوراک وزراعت کے مطابق دنیا بھر میں گدھوں کی مجموعی آبادی 50.5 ملین اور خچروں کی 7.9 ملین ہے، جن میں سے 99 فیصد سے زائد جانور کم اور درمیانی آمدنی والے ممالک میں محنت ومشقت اور باربرداری کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ تنہا ایتھوپیا میں گدھوں کی تعداد 21 لاکھ سے متجاوز ہے، جبکہ سوڈان، بھارت، پاکستان اور چاڈ میں بھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔

گدھے کی قوتِ حافظہ کو عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، تاہم یونیورسٹی آف کیلیفورنیا (ڈیوس) اور یونیورسٹی آف کورڈوبا کے محققین کی ایک سائنسی تحقیق، جو 2024 میں جرنل آف ویٹرنری بیہیویئر میں شائع ہوئی، یہ ثابت کرتی ہے کہ گدھے اشیا کے مستقل وجود کے تصور کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ان کا قلیل مدتی حافظہ کم از کم 1 منٹ اور 30 سیکنڈ تک مکمل فعال رہتا ہے۔ اس تحقیق کے دوران 12 گدھوں کی دو مراحل میں آزمائش کی گئی؛ پہلے مرحلے میں 30 سیکنڈ اور دوسرے میں 1 منٹ تک چھپائی گئی شے کا مقام یاد رکھنے کا مشاہدہ کیا گیا۔ نتائج سے واضح ہوا کہ گدھے گھوڑوں کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دیگر جانوروں کی مانند انتہائی پیچیدہ ذہنی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ سن 2024 ہی کی ایک اور سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ گدھوں کی فکری صلاحیتوں میں پایا جانے والا وراثتی تنوع اس امر کی علامت ہے کہ وہ محض "ضدی" نہیں بلکہ حقیقی فہم وفراست کے مالک ہیں۔ ان کا حافظہ اس قدر قوی ہوتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ طے کیے گئے راستے کو مدتوں یاد رکھتے ہیں، اور اگر کسی مقام پر ان کو گزند پہنچی ہو تو وہ دوبارہ وہاں قدم رکھنے سے صاف گریز کرتے ہیں۔

گدھے کی نمایاں ترین خصوصیت اس کا شدید احساسِ خودحفاظتی ہے۔ گھوڑے عموماً خوف کے زیرِ اثر بے تحاشا بھاگتے ہوئے کھائی تک میں گر سکتے ہیں، لیکن گدھا کسی بھی دباؤ میں آکر خطرے کی جانب ایک قدم بھی نہیں بڑھاتا۔ گدھوں کی فطرت ہے کہ وہ کسی آفت کے وقت یا تو ساکت ہوجاتے ہیں یا پھر مجتمع ہوکر شکاری جانور کا بے جگری سے سامنا کرتے ہیں، جو کم نفوس والے گروہ کے لیے ایک کارگر دفاعی حکمتِ عملی ہے۔ دی ڈونکی سینکچوری کے مطابق گدھے میں خودحفاظتی کی حس بے حد تیز ہوتی ہے اور وہ ہر اس کام سے قطعی انکار کردیتا ہے جس میں خطرے کا شائبہ ہو۔ یہ نام نہاد "ضد" جسے انسانی لاعلمی خامی تصور کرتی ہے، درحقیقت اس کی عمیق فہم وفراست کا مظہر ہے کیونکہ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے تمام صورتِ حال کا باریک بینی سے جائزہ لیتا ہے۔

گدھے کے بڑے کان محض اس کی ظاہری ساخت تک محدود نہیں بلکہ یہ ایک طاقتور رڈار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے کان مختلف سمتوں میں آزادانہ حرکت کرکے آواز کے سرچشمے کا قطعی پتا لگالیتے ہیں، اور یہی حسی تیزی اسے قرب وجوار کے ماحول کی معمولی ترین آہٹ سے بھی باخبر رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ وسیع وعریض کان جسم کے درجہ حرارت کو متوازن رکھنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر موجود خون کی باریک نالیاں اضافی گرمی خارج کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں، جو صحرائی خطوں کے لیے قدرت کی ایک شاندار موافقت ہے۔

گدھے کے مزاج کا ایک ایسا روشن رُخ بھی ہے جو بیشتر نگاہوں سے پوشیدہ رہا ہے۔ یہ بظاہر خاموش اور دھیما جانور بھیڑیوں، لومڑیوں اور درندہ صفت آوارہ کتوں کے سامنے ایک چوکنا محافظ ثابت ہوا ہے۔ جرنل پیئر جے میں 2026 میں شائع ہونے والے ایک عالمی تحقیقی جائزے کے مطابق گدھوں کو بھیڑیوں، جنگلی کتوں، لومڑیوں اور لنکس کے تدارک کے لیے بے حد مؤثر پایا گیا ہے۔ ہسپانیہ کے ایک آزمائشی منصوبے میں چار مویشی فارموں پر ایک ایک زامورانو لیونیز نسل کا گدھا تعینات کیا گیا، اور 12 ماہ بعد درندوں کے حملوں میں نمایاں کمی ریکارڈ کی گئی۔ جنوبی افریقہ میں گدھوں کی تعیناتی کے دوران بھیڑ کے بچوں کے دودھ چھڑانے کی شرح 91 سے 100 فیصد تک رہی جبکہ چھوٹے مویشیوں کے نقصان کی شرح گھٹ کر صفر تا 10 فیصد پر آگئی۔ تاہم محققین اس امر کی نشان دہی بھی کرتے ہیں کہ بھیڑیوں کے بڑے غول کے سامنے گدھوں کی مدافعت محدود ہوسکتی ہے، نیز ان کی کارکردگی زمینی ہیئت، درندوں کے طریق کار اور جانور کے ذاتی مزاج پر بھی منحصر ہے۔ دوسری طرف سوئس حکومت نے بھیڑیوں کے خلاف گدھوں کے بطور محافظ استعمال کی باضابطہ اجازت دینے سے احتراز کیا، کیونکہ ان کے نزدیک یہ امر اب تک قطعی سائنسی بنیادوں پر ثابت نہیں کہ گدھے ہر نوع کے خطرے میں ناقابلِ تسخیر ڈھال بن سکتے ہیں۔

گدھی کا دودھ دنیا کی گراں ترین ڈیری مصنوعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک گدھی روزانہ محض 200 تا 300 ملی لیٹر دودھ دیتی ہے، اور یہی محدود مقدار اس کی نایابی اور قدر وقیمت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ یورپ اور امریکا میں گدھی کا دودھ 60 تا 130 ڈالر فی لیٹر تک فروخت ہوتا ہے، جبکہ بھارت میں اس کی قیمت 5,000 تا 7,000 روپے فی لیٹر تک جاپہنچتی ہے۔ البانیہ میں گدھی کے دودھ سے تیار کردہ پنیر 50 یورو فی کلو سے زائد نرخ پر دستیاب ہے۔ اس دودھ میں حیاتین، معدنیات اور اینٹی آکسیڈنٹس کی وافر مقدار پائی جاتی ہے، اور اس کے اجزا انسانی ماں کے دودھ سے گہری مشابہت رکھتے ہیں، جس کے باعث یہ جلدی صحت اور جسمانی قوتِ مدافعت میں بہتری کے لیے اکسیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ گدھے کی سب سے مسحور کن اور دل گداز صفت اس کا جذباتی وجود ہے۔ گدھے باہمی طور پر ایک مضبوط جوڑی دار رشتہ قائم کرتے ہیں جسے سائنسی اصطلاح میں "پیئر بانڈ" کہا جاتا ہے، اور یہ تعلق ان کی بقا اور خوش حالی کے لیے لازمی ہے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں ماں کی اہمیت

زیبا نسیم مجبیٰ

ماں اللہ کی تخلیق کردہ ممتا کا مجسمہ ہے، جو بچے کی پہلی دھڑکن، پہلی مسکراہٹ اور ہر سانس میں پنہاں ہوتی ہے، جیسے زمین ماں زمین کی طرح پالتی ہے۔ جذباتی طور پر، اس کی قربانیاں آنکھیں نم کر دیتی ہیں راتوں کی نیندیں، درد کی آہوں، اور لامتناہی محبت کا سمندر جو ہمیشہ بہتا رہتا ہے، ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ماں نہ صرف اللہ کی نعمت بلکہ جنت کا راستہ اور زندگی کا سب سے خوبصورت تحفہ ہے

اسلام کی روشن روشنی میں ماں کی اہمیت کو دیکھیں تو قرآنِ مجید فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا، ماں نے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر اسے جنا" (15:46)، جبکہ نبی رحمت ﷺ نے فرمایا: "تمہاری جنت ماں کے قدموں تلے ہے"

اسلام نے والدین خصوصاً ماں کے مقام کو غیر معمولی عظمت دی ہے۔ قرآنِ مجید میں بار بار والدین کے ساتھ حسنِ سلوک احترام اور شکرگزاری کی تلقین کی گئی ہے جبکہ احادیثِ نبویہ میں ماں کی خدمت کو جنت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ ذیل میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ماں کی اہمیت کو واضح کیا جارہا ہے۔

قرآنِ مجید میں ماں کا مقام

(الف) ماں کی قربانی اور تکلیف کا اعتراف

قرآنِ مجید ماں کی حیثیت بیان کرتے ہوئے انسان کو یاد دلاتا ہے کہ ماں نے حمل اور پیدائش کے مراحل میں تکلیفیں برداشت کیں۔

"ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے تکلیف پر تکلیف اٹھا کر پیٹ میں اٹھائے رکھا اور تکلیف ہی کے ساتھ اسے جنا۔"

(15:46)

یہ آیت انسان کو ماں کی محنت درد اور قربانی کا احساس دلاتی ہے تاکہ وہ ماں کے حقوق پہچانے اور ناشکری سے بچے۔

(ب) والدین کے ساتھ بہترین اخلاق اور دعا کی تعلیم

قرآن صرف اچھے برتاؤ کا حکم نہیں دیتا بلکہ گفتگو کے آداب عاجزی اور دعا بھی سکھاتا ہے۔

"والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ انہیں اُف تک نہ کہو۔ ادب کے ساتھ بات کرو۔ اور کہو۔ اے میرے رب۔ ان دونوں پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔"

(24-23:17)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کے بڑھاپے میں ان کی خدمت نرمی احترام اور ان کے لیے دعا کرنا دینی ذمہ داری ہے۔

(ج) اطاعت کی حد۔ شرک میں کسی کی بات نہیں مانی جائے گی

اسلام والدین کی اطاعت کا درس دیتا ہے لیکن ایمان کے معاملے میں اصول واضح ہے۔

"اگر وہ تجھے مجبور کریں کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے تو ان کی بات نہ مان۔"

(8:29)

اسی کو مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا۔

"اطاعت نہ کر مگر دنیا میں ان کے ساتھ انصاف اور اچھے برتاؤ کے ساتھ رہ۔"

(15-14:31)

یعنی عقیدے میں غلط بات نہیں مانی جائے گی لیکن دنیاوی معاملات میں والدین حتیٰ کہ غیر مسلم ہوں ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور اچھا ساتھ برقرار رہے گا۔

احادیثِ نبویہ میں ماں کی عظمت

(الف) جنت کا راستہ۔ ماں کی خدمت

نبی کریم ﷺ نے ماں کی خدمت کو جنت کے ساتھ جوڑ دیا۔

"تمہاری جنت تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔"

(احمد نسائی)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ماں کی اطاعت خدمت اور دلجوئی انسان کے لیے جنت کے بڑے اسباب میں سے ہے۔

(ب) حسنِ صحبت میں ماں کا حق سب سے زیادہ

ایک شخص کے سوال پر نبی ﷺ نے تین بار ماں کا نام لے کر ماں کے حق کو مقدم کیا۔

"سب سے زیادہ حق دار کون۔ فرمایا۔ تمہاری ماں۔ پھر تمہاری ماں۔ پھر تمہاری ماں۔ پھر تمہارا باپ۔" (بخاری مسلم)

یہ واضح کرتا ہے کہ عام حالات میں خدمت توجہ اور حسنِ سلوک کے معاملے میں ماں کا درجہ سب سے بلند ہے۔

(ج) والدین کے انتقال کے بعد بھی حقوق باقی رہتے ہیں

اسلام میں والدین کے حقوق صرف زندگی تک محدود نہیں۔

"ان کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کرو۔ ان کے وعدے پورے کرو۔ ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کا احترام کرو۔" (ابو داؤد ابن ماجہ)

یعنی ماں کے انتقال کے بعد بھی دعا صلہ رحمی اور ان کے تعلقات کی پاسداری کے ذریعے نیکی جاری رہتی ہے۔

(د) والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ

نبی ﷺ نے والدین کی نافرمانی کو بڑے گناہوں میں شمار فرمایا۔

"کبیرہ گناہ۔ والدین کی نافرمانی۔" (بخاری مسلم)

یہ بتاتا ہے کہ ماں باپ کو دکھ دینا یا ان کے حقوق ادا نہ کرنا معمولی نہیں بلکہ سخت وعید والا عمل ہے۔

(ہ) غیر مسلم ماں کے ساتھ بھی بھلائی

صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت اسماءؓ کی والدہ مشرکہ تھیں پھر بھی نبی ﷺ نے فرمایا۔

"اپنی ماں کے ساتھ بھلائی کرو۔" (بخاری مسلم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے ساتھ اچھا سلوک دین نسل یا حالات کی قید سے بلند ہو کر ایک عظیم اخلاقی اور شرعی ذمہ داری ہے۔

قرآن و حدیث سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ اسلام میں ماں کا مقام انتہائی بلند ہے۔ ماں کی تکلیفوں کو یاد رکھنا اس کے ساتھ نرم گفتگو کرنا اس کی خدمت کرنا اس کے لیے دعا کرنا اور اس کی دلجوئی کو دین کا اہم حصہ قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر والدین غیر مسلم ہوں تب بھی دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ انصاف احترام اور حسنِ سلوک لازم ہے۔ خلاصہ یہ کہ ماں کی خدمت اور عزت نہ صرف اخلاقی فریضہ ہے بلکہ اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کا مضبوط ذریعہ بھی ہے۔

مولانا صادق انور ندوی کی کتاب 'بنیادی اسلامیات' (گھر گھر دین) ایک بہترین کاوش

منت اللہ ندوی

8004911035

''بنیادی اسلامیات (گھر گھر دین)'' ایک اہم اور مفید دینی کتاب ہے، جس کے مصنف محمد صادق انور ندوی (ابنِ کمال) ہیں۔ کتاب کا عنوان ہی اس کے بنیادی مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو عام فہم انداز میں گھر گھر تک پہنچایا جائے اور ہر مسلمان، خصوصاً نئی نسل، کو دین کی بنیادی باتوں سے واقف کرایا جائے۔

اسلامی زندگی صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ عقائد، اخلاق، معاملات، معاشرت اور روزمرہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے بنیادی دینی معلومات کا حصول ہر مسلمان کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ایسی کتابیں اس ضرورت کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، کیونکہ یہ قاری کو دین کی بنیادی تعلیمات سمجھنے اور اپنی عملی زندگی میں انہیں اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

مصنف نے ''گھر گھر دین'' کا خوب صورت تصور پیش کیا ہے۔ اس عنوان میں ایک دعوت بھی ہے اور ایک ذمہ داری کا احساس بھی کہ دینی تعلیم صرف مدارس یا مخصوص حلقوں تک محدود نہ رہے، بلکہ گھروں میں بھی دینی ماحول پیدا ہو اور بچوں، نوجوانوں اور بڑوں کو اپنی بنیادی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہو۔

کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا بنیادی اسلامیات پر مرکوز ہونا ہے۔ اس نوعیت کی کتاب طلبہ، عام قارئین، والدین اور دینی معلومات حاصل کرنے کے خواہش مند

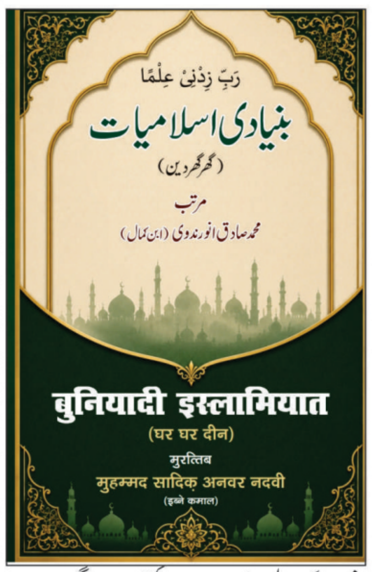

افراد کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر بنیادی مسائل کو آسان زبان، مختصر انداز اور عملی مثالوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہو تو اس کی افادیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اردو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی ہے جو عام لوگوں کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

موجودہ دور میں جب نئی نسل مختلف ذرائع ابلاغ سے بے شمار معلومات حاصل کر رہی ہے، دینی معلومات کو مستند، آسان اور منظم انداز میں پیش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ''بنیادی اسلامیات (گھر گھر دین)'' اسی ضرورت کی طرف ایک قابلِ قدر توجہ معلوم ہوتی ہے۔

مسلم اسکولوں، مکاتب، وغیرہ میں اسلامیات کی تعلیم کے لیے یہ کتاب نہایت ہی مفید ہے، مسلم اسکولوں میں اسلامیات کی جو تعلیم دی جاتی ہے میرے خیال سے اس کتاب کو سامنے رکھ کر حصوں میں تقسیم کر کے نصاب میں شامل کریں تو اسلامیات کی کی تعلیم کے لیے وہ ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔۔۔ کیونکہ اس میں کلمے، اسماء الحسنیٰ، روزمرہ کی دعائیں، مخصوص سنتیں، عقاید، سیرت وغیرہ سوال جواب کی شکل میں، عبادت میں نماز کے طریقے وغیرہ، اخیر میں چالیس احادیث ہیں جو ایک بچے کی دینی تعلیم کے لیے کافی ہوسکتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب دینی شعور بیدار کرنے، بنیادی اسلامی تعلیمات سے واقفیت پیدا کرنے اور گھروں میں دینی ماحول کو فروغ دینے کے حوالے سے ایک مفید کاوش ہے۔ مصنف محمد صادق انور ندوی کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے بنیادی دینی تعلیم کو عام قارئین تک پہنچانے کے لیے ایک ایسی کتاب پیش کی جس کا پیغام ہی ''گھر گھر دین'' ہے۔ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کی محنت کو قبول فرمائیں مزید انکی قلم کو تقویت ملے جس سے وہ قوم وملت کی اور خدمت کرسکیں۔

نورالحسن نیر: لکھنوی زبان وتہذیب کا میر کارواں

عمیر منظر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی۔ لکھنؤ کیمپس

نور اللغات کے مولف مولوی نور الحسن نیر کا آج یوم وفات ہے۔ وہ 1865 میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی وفات/ 6 ستمبر 1936 کو ہوئی۔ مدفن جھنجھری روضہ کاکوری میں ہے۔ وہ ایک باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا پیشہ وکالت کا تھا مگر اسے ترک کر کے انھوں نے لغت نویسی کو اختیار کیا۔ اور ایک شخص کی محنت اور کوشش ادارہ جاتی حیثیت قرار پائی۔ سادات علویہ کے ایک علمی گھرانے سے ان کا تعلق تھا، جو نسب کے ساتھ ساتھ علم وادب کا بھی ممتاز خانوادہ تھا۔ ان کے والد محسن کاکوروی نعتیہ ادب کے حوالے سے اپنے زمانے میں ہی غیر معمولی شہرت رکھتے تھے اور یہ حیثیت آج بھی برقرار ہے۔ عربی زبان وادب میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اسی گھرانے کا ایک فرد ایک بڑی لغت کا مولف بھی بنا۔

مولوی نور الحسن نے ابتدائی تعلیم اپنے والد محسن کاکوری سے حاصل کی۔ اس کے بعد علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید مولوی ہدایت علی بریلوی سے نحو اور منطق کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ مولوی رحم الہی سے مشکوۃ وموطا کا درس لیا۔ شاعری میں والد محترم اور امیر مینائی سے تلمذ تھا۔ بارہ بنکی، اٹاوہ اور بعض دیگر مقامات سے انگریزی شروع کی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد 1897 میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ اور پھر وکالت میں مصروف ہوگئے۔

دوران وکالت ہی شعرگوئی اور مشاعروں میں شرکت کا آغاز ہوا۔ آسی لکھنوی، اثر لکھنوی، امین سلونوی اور شوکت تھانوی کے ساتھ مشاعرہ پڑھے۔ والد محترم محمد محسن کاکوروی کے نعتیہ دیوان کو مرتب کیا۔ خود بھی نعت کہتے تھے اور اسی دوران حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔ شعرگوئی میں بڑی مہارت پیدا کی یہاں تک کہ ان کے بہت سے شاگرد بھی ہوگئے اور باقاعدہ ان کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ شعر وادب کی یہی مصروفیتیں آگے کا راستہ ہموار کرنے لگیں۔ نظم ونثر دونوں میں ان کے جوہر نکھرنے لگے۔ ایک تفصیلی مضمون انھوں نے 'اصلاح زبان اور لکھنؤ کی گراں قدر خدمات' کے عنوان سے لکھا۔ زبان ومحاورات کی تبدیلیوں کو پیش کیا اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایک ہی لفظ کو دو شہروں کے ایک اور شاعر کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

شعر وادب سے اسی دلچسپی کے سبب ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اردو زبان کا کوئی مستند لغت تیار کیا جائے۔ اس کا اظہار انھوں نے نور اللغات کے مقدمے میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اختلاف کی صورت میں ہمارے پاس ایسی کوئی دستاویز نہیں ہے۔ وہ عوام وخواص دونوں کو غلطیوں سے بچانا چاہتے اور زبان کو ایک مستند ذریعہ اظہار کی صورت پیش کرنے کے آرزومند تھے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت بہت سے لغت ضرور ہیں مگر ان میں استناد کی کمی ہے۔ نورالحسن نیر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر ان کے بعض احباب کو اندازہ تھا کہ لغت نویسی کا کام یہ کرسکتے ہیں۔ اس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

1914 میں میرے بہت سے ذی علم احباب نے طرح طرح سے ہمت بڑھا کر مجبور کیا کہ میں باوجود پیشہ وکالت اور دیگر مشاغل کے اس ذمہ داری کا بار اپنے سر لوں۔ اور اپنے اوقات کا زیادہ حصہ اس نہایت ضروری کام کے لیے وقف کردوں۔ میں نے عذرات کی لپیٹ میں اپنے حالات کا اظہار بہت کچھ کیا لیکن کچھ سماعت نہ ہوئی اور مجبور ہو کر تعمیل ارشاد کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے کتب خانہ میں موجود کتب کے علاوہ اس ضرورت کے لیے متعدد بہ کار آمد کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا اور ایک خاص دفتر اس کا قائم کیا۔ محرر ملازم رکھے ان کا صرفہ اپنے ذمہ لیا۔ اور الفاظ ومحاورات کو بہ ترتیب حروف تہجی لکھنا شروع کر دیا۔ میں نے لغت کی تکمیل کا ارادہ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی جب اس کی اشاعت کی دشواریوں پر نظر جاتی ہے تو ہمت پستی کی جانب جھکنے کا ارادہ کرتی ہے۔ (مقدمہ نور اللغات)

درج بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں اس راہ کی دشواریوں کا علم تھا اور اسی لیے پوری تیاری کر کے انھوں نے لغت نویسی کی راہ اختیار کی۔ حالانکہ اس سے پہلے متعدد لغت موجود تھے۔ جب امیر اللغات کی ترتیب کی خبر سنی تو خوش ہوئے مگر جب اس کی پہلی جلد دیکھی تو دوبارہ انھیں لغت نویسی کا خیال آیا۔ نور اللغات کی تیاری کا۔ 1914 میں سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی تصحیح اور طباعت کے لیے لکھنؤ کے پاٹانالہ محلے میں پریس قائم کیا۔ پہلی جلد 1924 میں شائع ہوئی۔ دوسری جلد 1927 تیسری جلد 1929 اور چوتھی جلد 1931 میں شائع ہوئی۔

نور اللغات کی نمایاں خوبی تو یہی ہے کہ اس میں صرف لفظ کے معنی نہیں دیے ہیں بلکہ لفظ کے استعمال کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔ بڑی تعداد میں محاورات دیے گئے ہیں۔ نور اللغات میں محاورات کے استعمال کو خاص اہمیت دی گئی ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس لغت کے ذریعے اردو کے ایک بڑے کلاسیکی شعری اور لسانی سرمائے کے ذخیرے سے بھی استفادہ کا موقع ملتا ہے۔ اس طور سے اسے ایک استنادی لغت کا درجہ حاصل ہے کہ جس میں اردو کے معتبر شعراء کے اشعار کسی لفظ کی سند کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ لفظ کی اصل کیا ہے اس کا ماخذ کیا ہے اور اس کی دیگر نوعیتیں کیا ہیں اس کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ اعراب بھی دیے گئے ہیں تاکہ صحیح تلفظ معلوم ہوسکے۔ اسی طرح سے لکھنوی زبان کے نمائندگی بھی اس میں ملتی ہے بالخصوص محاورات کے استعمال کے سلسلے میں اسی وجہ سے اس لغت کو بعض لوگ لکھنؤ کے لسانی دبستان کی ایک نمائندہ لغت قرار دیتے ہیں۔

اس لغت کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ اس میں بعض الفاظ کے تحت بہت زیادہ وسعت ہے۔ اسی طرح امالہ کے قواعد کو اصولوں کی روشنی میں باقاعدہ پیش کرنا نور اللغات کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ بعض الفاظ کے کے ضمن میں معنی کی صراحت بھی خوب ہے۔ مثلاً تماکو، تمباکو۔ اس لفظ کے بارے میں لکھتے ہیں:

مذکر، یہ لفظ امریکہ کی زبان میں ٹوبے کو تھا اصل میں ایک قسم کا پودا ہے جس کے پتے حقّے میں پیتے اور پان میں کھاتے ہیں۔ ہندوستان میں اس کے ساتھ گڑ ملا کر قلیاں میں پیتے ہیں اور تماکو کہتے ہیں۔ اس کا رواج جلال الدین اکبر کے وقت میں اول اول دکن میں پھر تمام ہند میں ہوا

تمباکو بھی ہوا ہے کڑوا ہم سے

رک رک کر بولتا ہے حقہ ہم سے (منیر)

لکھنؤ کی بیگمات پینے کا ہو تو تماکو اور پان میں کھانے کا ہو تو تمباکو۔ دہلی والے پینے کا ہو تو تمباکو اور کھانے کا ہو تو زردہ کہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نور اللغات میں دلی اور لکھنؤ کو زیادہ استناد کا درجہ دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے بعض لوگ معترض بھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نور اللغات میں الفاظ کی تحقیق اور تفصیل زیادہ ملتی ہے بعض دیگر لغات کے مقابلے میں۔ اس کو اس وجہ سے بھی سراہا گیا کہ امیر اللغات کے نامکمل رہنے کا جو افسوس تھا اس کی تلافی اس سے ہوگئی۔ منشی دیا نرائن نگم، جوش ملیح آبادی، مولوی عبدالحق نے نور الحسن نیر کی ستائش کی ہے۔ تحقیق کی خوش اسلوبی کی داد گئی ہے۔ اثر لکھنوی نے بہت سے اعتراضات اس پر قائم کیے ہیں مگر اس کے بارے میں نیاز فتح پوری نے رائے دی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ فرہنگ اثر نور اللغات کی غلطیاں ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ حالانکہ فرہنگ اثر میں ذاتی مشاہدہ الفاظ کے سلسلے میں زیادہ ہے۔ اور استناد کم ہے

نور الحسن نیر کو اس لغت کے لیے سخت مراحل کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے ہار نہیں مانی۔ ان کے سوانح نگار عزیز الرحمن علیم نے اس بارے میں لکھا ہے:

جلد اول کی اشاعت میں کافی سرمایہ لگ گیا یہاں تک کہ دوسری جلد کی اشاعت میں دشواری پیدا ہو رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے ارادہ کیا کہ پہلی جلد کے فروخت ہونے کے بعد دوسری جلد شائع کی جائے۔ اسی لیے دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ مگر اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ اور پھر راستہ نکل آیا۔ سر ولیم میور کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی تھی انھوں نے ازراہ نوازش پہلی جلد کی سو کاپیاں خریدیں نیز محکمہ تعلیم سے دو ہزار روپے سالانہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ تین سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

نور الحسن نیر کی وفات کو نوے برس ہوگئے۔ یوں تو ان کے بہت سے کارنامے ہیں مگر تن تنہا نور اللغات ہی ان کے لیے زندہ جاوید ہے۔ ہندستان اور پاکستان سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس لغت پر نقد بھی کیا گیا مگر اس کی اہمیت آج بھی مسلّم ہے۔

مسجد: عبادت گاہ سے خدمت اور فلاح کا مرکز تک

ایمان سکین

جب ہم مسجد کا لفظ سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں عموماً سب سے پہلے نماز کا تصور ابھرتا ہے۔ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے نمازی۔ اذان کی آواز۔ قرآن کی تلاوت اور عبادت کی پرسکون فضا۔ اور یہ بالکل فطری بھی ہے۔ مسجد عبادت گاہ ہے اور وہ مقام ہے جہاں مسلمان اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

لیکن شاید کبھی کبھی ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مسجد صرف وہ جگہ نہیں جہاں ہم چند منٹ کے لیے نماز ادا کرنے جاتے ہیں اور پھر واپس لوٹ آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں مساجد علم و تعلیم۔ خیرات۔ اجتماعی گفتگو۔ پناہ اور سماجی خدمت کے مراکز رہی ہیں۔ مسجد معاشرے کے مسائل سے الگ تھلگ نہیں تھی بلکہ وہ انہی مسائل کے درمیان موجود رہتی تھی۔

قرآن مومنوں کو یاد دلاتا ہے کہ نیکی صرف عبادات اور ظاہری رسوم تک محدود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"نیکی صرف یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ پر ایمان لائے اور اپنی محبت کے باوجود اپنا مال رشتہ داروں یتیموں محتاجوں اور مسافروں کو دے۔"

قرآن 177:2

یہ آیت نہایت خوبصورتی کے ساتھ ایمان کو انسانی ذمہ داری سے جوڑتی ہے۔ نماز اہم ہے لیکن اس شخص کے لیے ہمارا طرز عمل بھی اہم ہے جو ہمارے پہلو میں کھڑا ہے اور اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔

ذرا ایک ایسی ہندوستانی مسجد کا تصور کیجیے جو خون عطیہ کرنے کی مہمات کا مرکز بن جائے۔ جمعے کی نماز کے بعد لوگ صرف اپنے گھروں کو واپس جانے کے بجائے رضاکاروں کے ساتھ مل کر خون عطیہ کرنے کا کیمپ لگائیں۔ جہاں نوجوان حادثات کے متاثرین۔ سرجری کے مرحلے سے گزرنے والے مریضوں اور سنگین بیماریوں سے لڑنے والے افراد کے لیے خون عطیہ کریں۔ یوں مسجد ایک ایسی جگہ بن جائے جہاں کسی کی جان بچانا پوری برادری کی مشترکہ کوشش بن جائے۔

یہ عبادت سے الگ کوئی عمل نہیں ہے۔ بلکہ یہ عبادت ہی کا ایک اور اظہار ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اور جس نے ایک جان کو بچایا گویا اس نے تمام انسانوں کو بچایا۔"

قرآن 32:5

یہی جذبہ سیلاب اور دوسری قدرتی آفات کے دوران بھی نظر آسکتا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں مساجد خوراک۔ کپڑوں۔ ادویات اور دیگر ضروری اشیا جمع کرنے اور متاثرین تک پہنچانے کے مراکز بن سکتی ہیں۔ جس مسجد میں باورچی خانہ موجود ہو وہاں بے گھر ہونے والے خاندانوں کے لیے کھانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مسجد کے کمرے عارضی پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہوسکتے ہیں۔ اس کے رضاکار بزرگوں۔ بچوں اور ان لوگوں کی مدد کرسکتے ہیں جن کے پاس مدد کے لیے کوئی اور سہارا موجود نہیں۔

مسجد تعلیم کا مرکز بھی بن سکتی ہے۔

ایسی برادریوں میں جہاں بچوں کو اچھی تعلیمی رہنمائی اور کوچنگ تک رسائی حاصل نہیں ہوتی وہاں مسجد اسکول کے بعد مناسب اور مفت یا کم خرچ تعلیمی کلاسوں کا انتظام کرسکتی ہے۔ ریٹائرڈ اساتذہ۔ کالج کے طلبہ اور مختلف شعبوں سے وابستہ ماہرین رضاکارانہ طور پر ریاضی۔ سائنس۔ زبانیں۔ کمپیوٹر اور مسابقتی امتحانات کی تیاری جیسے مضامین پڑھا سکتے ہیں۔ تعلیمی تربیت کے ساتھ ساتھ بچے دیانت داری۔ نظم وضبط۔ ہمدردی اور ذمہ داری بھی سیکھ سکتے ہیں۔

تعلیم کو دینی زندگی سے باہر کی چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ قرآن مجید کا سب سے پہلا نازل ہونے والا حکم تھا۔

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔"

قرآن 1:96

جو مسجد کسی بچے کو ریاضی کے مشکل سوال کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ کسی طالب علم کو اعلیٰ تعلیم کی طرف رہنمائی فراہم کرتی ہے یا کسی نوجوان کو کوئی مفید ہنر سیکھنے میں مدد دیتی ہے وہ پوری برادری کی مضبوطی میں اپنا حصہ ڈال رہی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے امکانات موجود ہیں۔ مشاورت اور خاندانی معاونت کے اجلاس۔ نوجوانوں کے لیے پیشہ ورانہ رہنمائی۔ ضرورت مندوں میں کھانے کی تقسیم۔ بیواؤں اور بزرگوں کی مدد۔ طبی کیمپ۔ ماحول کے تحفظ کی مہمات۔ قدرتی آفات سے نمٹنے کی تیاری کے پروگرام اور مالی مشکلات سے دوچار افراد کی معاونت جیسے کام مسجد کے ذریعے انجام دیے جاسکتے ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے۔

"اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔"

قرآن 2:5

شاید یہی ایک زندہ مسجد کا وسیع تر مفہوم ہے۔ اس کے دروازے صرف نماز گاہ کی طرف نہ کھلیں بلکہ پوری برادری کی طرف بھی کھلیں۔

مسجد یقیناً ہمیں یہ سکھائے کہ اللہ کے سامنے کیسے کھڑا ہونا ہے۔ لیکن وہ ہمیں یہ بھی سکھا سکتی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ کیسے کھڑا ہونا ہے۔

سب سے مضبوط مسجد کی برادری شاید وہ نہیں جس کی عمارت سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔ بلکہ وہ ہو سکتی ہے جس کی موجودگی اس وقت محسوس ہو جب کوئی بھوکا ہو۔ کسی طالب علم کو مدد کی ضرورت ہو۔ کوئی خاندان بحران سے گزر رہا ہو۔ کسی مریض کو خون درکار ہو یا کوئی محلہ سیلاب کے بعد دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

نماز مسجد کے قلب میں ہے۔ لیکن ہمدردی۔ علم۔ خدمت اور اجتماعی ذمہ داری اس قلب کی رسائی کو کہیں زیادہ وسیع بنا سکتی ہے۔

مسجد محض ایسی جگہ نہیں ہونی چاہیے جہاں ہم جائیں۔ اسے ایسی جگہ ہونا چاہیے جہاں سے نیکی دنیا کی طرف روانہ ہو۔

اے ایم یو: نبیلہ خان نے جیتا ڈاکٹر کرنی سنگھ فیڈریشن کپ میں گولڈ میڈل

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج کے شعبہ بایوکیمسٹری کی بی ایس سی سالِ سوم کی طالبہ نبیلہ خان نے ڈاکٹر کرنی سنگھ جی رولر ڈربی فیڈریشن کپ 2026 میں طلائی تمغہ جیت کر یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔ نبیلہ خان اتر پردیش کی ٹیم کا حصہ تھیں، جس نے راجستھان کے بیکانیر میں منعقدہ قومی سطح کے اس مقابلے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

اتر پردیش کی ٹیم پورے ٹورنامنٹ میں ناقابل شکست رہی۔ ٹیم نے ابتدائی مقابلوں میں راجستھان کو 11-40، تلنگانہ کو 22-83 اور کرناٹک کو 5-36 سے شکست دے کر فائنل میں جگہ بنائی۔

قومی سطح کی اس چیمپئن شپ کا انعقاد رولر اسکیٹنگ فیڈریشن آف انڈیا نے کیا، جبکہ راجستھان اسکیٹ ایسوسی ایشن نے اس کی میزبانی کی۔ مقابلے میں ملک کی مختلف ریاستوں کی ٹیموں نے شرکت کی۔

صحافیوں پر حملہ جمہوریت کی آواز پر حملہ ہے عرفان جامی والا

نئی دہلی۔ معروف سماجی کارکن، صحافی، مصنف اور سیاسی مفکر عرفان جامی والا نے دو خاتون صحافیوں شاہین خان، 4 پی ایم نیوز نیٹ ورک اور نفیسہ خان، آزاد صحافی کے ساتھ دہلی پولیس کی جانب سے مبینہ طور پر کی گئی مار پیٹ کے واقعے پر گہری تشویش اور ناراضگی کا اظہار کیا ہے۔ عرفان جامی والا نے کہا کہ کسی صحافی کے ساتھ مبینہ زیادتی صرف ایک فرد کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ نہیں، بلکہ یہ صحافت کی آزادی، انسانی وقار اور جمہوری اقدار سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ صحافی کا کام سوال پوچھنا، عوام کے مسائل کو سامنے لانا اور معاشرے میں ہونے والے واقعات کی حقیقت عوام تک پہنچانا ہے۔ اگر کسی صحافی کی خبر یا سوال سے کسی ادارے یا افسر کو اختلاف ہو تو اس کا جواب قانون اور جمہوری طریقے سے دیا جانا چاہیے، طاقت یا تشدد کے ذریعے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ خاتون صحافیوں کے ساتھ مبینہ بدسلوکی کا معاملہ مزید سنجیدہ ہے۔ شاہین خان اور نفیسہ خان کے معاملے کی غیر جانب دار، شفاف اور منصفانہ تحقیقات ہونی چاہئیں۔ اگر تحقیقات میں کسی پولیس اہلکار کی ذمہ داری ثابت ہوتی ہے تو قانون کے مطابق کارروائی کی جانی چاہیے۔ عرفان جامی والا نے کہا کہ صحافیوں کا تحفظ صرف سرکاری بیانات اور کاغذی کارروائی تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ ملک بھر میں صحافی مشکل حالات میں کام کرتے ہیں اور بدعنوانی، جرائم، ناانصافی اور عام شہریوں کے مسائل کو سامنے لاتے ہیں۔ ایسے میں ان کی حفاظت اور عزت کو یقینی بنانا بھی ریاست اور معاشرے کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ مسلم اتحاد ایسوسی ایشن کے قومی صدر اور بانی کی حیثیت سے عرفان جامی والا نے کہا کہ ان کی تنظیم عوامی حقوق اور جمہوری اقدار سے متعلق معاملات پر آئینی اور قانونی طریقے سے آواز اٹھاتی رہے گی۔ انہوں نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ موجودہ دور میں مسلمانوں، بالخصوص جامعہ اور علی گڑھ سے وابستہ طلبہ کو نشانہ بنائے جانے کی شکایات سامنے آرہی ہیں۔ ان معاملات میں بھی کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے غیر جانب دارانہ تحقیقات اور شواہد کی بنیاد پر کارروائی ہونی چاہیے۔ انہوں نے کہا: ''وردی قانون اور اختیار کی علامت ہے، خوف اور تشدد کی نہیں۔ پولیس عوام کی حفاظت کرتی ہے اور صحافی عوام کی آواز بن کر سامنے آتا ہے۔ جمہوریت میں اختلاف کا جواب تشدد نہیں بلکہ قانون، آئین اور مکالمہ ہونا چاہیے۔'' عرفان جامی والا نے ملک کے تمام صحافیوں اور صحافتی تنظیموں سے اپیل کی کہ وہ صحافت کی آزادی، صحافیوں کے وقار اور شہری حقوق کے تحفظ کے لیے متحد رہیں۔ انہوں نے کہا: ''قلم کو دبانے کی کوشش کی جا سکتی ہے، لیکن سچائی کو ہمیشہ کے لیے خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ صحافی کی آواز دراصل عوام کی آواز ہے، اور جمہوریت میں عوام کی آواز کا احترام ضروری ہے۔''

ورنگل ممنور ایرپورٹ کیلئے عوام نام تجویز کریں: چیف منسٹر ریونت ریڈی

حصول اراضی کے لیے 295 کروڑ روپے مختص، دسمبر میں سنگ بنیاد رکھنے کی تیاری

حیدرآباد۔ : ورنگل کے تاریخی ممنور ایرپورٹ کے قیام اور جامع توسیع کے اقدامات اب اپنے سب سے اہم اور قطعی مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ چیف منسٹر اے ریونت ریڈی نے ورنگل اور تلنگانہ کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ ممنور ایرپورٹ کے لیے مناسب نام تجویز کریں۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ عوامی حکومت کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں ہی ایرپورٹ کا دیرینہ خواب اب زمینی سطح پر حقیقت کا روپ اختیار کر رہا ہے۔ چیف منسٹر نے بی آر ایس پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ 10 سال کے طویل عرصے میں صرف خاندانی مفادات اور پرتعش فارم ہاؤزس پر توجہ مرکوز رکھی اور ایرپورٹ کے قیام پر کوئی عملی اقدامات نہیں کئے۔ انہوں نے بتایا کہ کانگریس حکومت نے حصول اراضی کے لیے 295 کروڑ روپے مختص کر کے ضروری زمین حاصل کی اور اسے ایرپورٹ اتھاریٹی آف انڈیا کے حوالے کر دیا۔ چیف منسٹر نے کہا کہ یہ صرف ایرپورٹ نہیں ہے بلکہ شمالی تلنگانہ کے لیے صنعتوں، سیاحت، تعلیم، روزگار اور نئی سرمایہ کاری کا ایک نیا گیٹ وے قرار دیا اور کہا کہ وہ ممنور ایرپورٹ سے پہلی پرواز کے منتظر ہیں۔ دوسری جانب ایرپورٹ اتھاریٹی آف انڈیا نے تمام اجازت ناموں، اراضی کے حصول اور تکنیکی معائنے کے مراحل کو مکمل کرتے ہوئے تعمیری کاموں کو تین مختلف پیاکجس میں تقسیم کر کے شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ابتدائی دو پیاکجس کے کاموں کے لیے الگ الگ ٹنڈر کا عمل پہلے ہی کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے۔ پہلے پیاکیج کے تحت ایرپورٹ کی 953 ایکر اراضی کے اردگرد باونڈری وال کی تعمیر کا کام شروع کیا جائے گا جب کہ دوسرے پیاکیج کے تحت جدید رن وے، احاطے میں گاڑیوں کی پارکنگ اور سیوریج سسٹم قائم کیا جائے گا۔ پراجکٹ کے تیسرے اور حتمی پیاکیج کے تحت 213.59 کروڑ روپے کی لاگت سے اسٹیٹ آف دی آرٹ، ڈومیسٹک ٹرمنل بلڈنگ، ایر ٹریفک کنٹرول ٹاور، فائر اسٹیشن اور الیکٹرک سب اسٹیشن کی تعمیر عمل میں لائی جائے گی۔ ایرپورٹ اتھاریٹی آف انڈیا نے اس فائنل پیاکیج کے لیے حال ہی میں ٹنڈرس طلب کیا ہے اور تمام دستاویزی کارروائیاں نومبر تک مکمل کرنے کی تیاری کی گئی ہے۔ ایرپورٹ اتھاریٹی کے ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ تمام تکنیکی مراحل کی تکمیل کے بعد دسمبر 2026 میں ورنگل ایرپورٹ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر انتظامات کئے جا رہے ہیں۔

کانگریس اقلیتی فنڈس خرچ کرنے میں ناکام، مجلس مسائل پر لڑنے سے قاصر۔ شیخ عبداللہ سہیل

اقلیتی فنڈز کا 61 فیصد حصہ خرچ نہیں ہوا، صرف اسمبلی کا مائیک آن ہونے پر بولنا جدوجہد نہیں

حیدرآباد۔ بی آر ایس کے سینئر قائد شیخ عبداللہ سہیل نے کانگریس حکومت اور مجلس پر اقلیتوں کے مسائل اور فلاح و بہبود کے معاملے میں دوہری ناکامی کا الزام عائد کیا ہے۔ حال ہی میں ختم ہونے والے اسمبلی کے اجلاس نے ایک طرف جہاں کانگریس حکومت کے فنڈز جاری نہ کرنے اور ناقص کارکردگی کو بے نقاب کیا ہے۔ وہی دوسری طرف مجلس کی جانب سے حکومت کو جھجھوڑنے حساب کے ساتھ جوادہی طلب کرنے میں ناکام رہنے کا الزام عائد کیا ہے۔ شیخ عبداللہ سہیل نے حکومت کے اپنے جاری کردہ اعداد و شمار کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ پچھلے دو مالیاتی سال میں اقلیتی بہبود کی اسکیمات کیلئے مختص کردہ 5,100.97 کروڑ روپے میں سے صرف 1,972.17 کروڑ روپے ہی خرچ کئے گئے ہیں جو کہ جملہ بجٹ کا صرف 38.7 فیصد ہے۔ انہوں نے تشویش ظاہر کی کہ بجٹ کا تقریباً دو تہائی حصہ خرچ نہیں ہوا جبکہ پچھلے مالیاتی سال میں بھی 2,844.2 کروڑ کے مقابلے میں صرف 1,010.63 کروڑ روپے (35.5 فیصد) ہی جاری ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ فیس ریمبرسمنٹ اور اسکالرشپس کی ہزاروں کروڑ روپے کی زیرالتواء بقایاجات اس بات کا واضح ثبوت ہیکہ حکومت طلبہ بالخصوص اقلیتی طلبہ کے تئیں کس قدر بے حس ہے۔ شیخ عبداللہ سہیل نے کہا کہ حکومت اقلیتی آبادی کے تناسب 14.27 فیصد کے مطابق بجٹ مختص کرنے سے بھی قاصر ہے۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس بڑے اعلانات کرتی ہے اور بجٹ دستاویزات میں انتہائی متاثر اعداد و شمار دکھاتی ہے لیکن یہ رقم زمین تک بالکل بھی نہیں پہنچتی۔ کاغذوں تک محدود رہ جانے والی مختص رقم نہ کسی طالب علم کو تعلیم دے سکتی ہے نہ کسی غریب خاندان کی مالی مدد کر سکتی ہے اور نہ ہی روزگار پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح کی شدید غفلت ماضی میں کبھی نہیں ہوئی جیسے اب دیکھنے کو مل رہی ہے۔ شیخ عبداللہ سہیل نے مجلس پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کی آواز قرار دینے والی یہ جماعت صرف چند سوال کرتے ہوئے یہ جتانے کی کوشش کرتی ہیکہ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اقلیتی بہبود کے غیر استعمال بجٹ کے بارے میں حکومت سے سوال کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ اس کی آواز صرف اس وقت نکلتی ہے جب اسمبلی کا مائیکرو فون آن ہوتا ہے۔ سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنے سے گریز کرتی ہے۔ احتساب کوئی موسمی چیز نہیں ہوسکتی۔ انہوں نے وقف املاک کی سیکشن 22A کے تحت تنازعات، سروے اور غلطیوں کے حل میں دونوں جماعتوں کے موقف کی مذمت کی۔

شیخ پیٹ مسجد کی تزئین نو و آہک پاشی تہذیبی ورثہ کی بحالی کیلئے محکمہ آثار قدیمہ کے اقدامات

حیدرا?باد۔ محکمہ ا?ثار قدیمہ نے شیخ پیٹ مسجد کی تزئین نو اور ا?ہک پاشی کے اقدامات شروع کر دیئے ہیں۔ شیخ پیٹ سے سات گنبد سڑک پر موجود قطب شاہی دور کی مسجد کے اطراف موجود جھاڑیوں کی صفائی کے علاوہ مسجد کی انتہائی خوبصورت عمارت کو تحفظ فراہم کرنے کے اقدامات کا محکمہ ا?ثار قدیمہ کی جانب سے ا?غاز کر دیا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ جلد ہی اس محفوظ تہذیبی ورثہ کو صفائی کے ذریعہ اس کی خوبصورتی کو بحال کرنے کے اقدامات کو مکمل کرنے کے اقدامات کئے جائیں گے۔ منصوبہ کے متعلق ریاستی محکمہ ا?ثار قدیمہ کے عہدیدار پروفیسر کے ارجن راو? نے بتایا کہ محکمہ ا?ثار قدیمہ نے شیخ پیٹ سرائے اور شیخ پیٹ مسجد کی ا?ہک پاشی اور اطراف و اکناف کے علاقہ کو سیاحوں کے لئے خوبصورت بنانے کے اقدامات شروع کئے ہیں اور اس سلسلہ میں ا?غا خان ٹرسٹ فار کلچر سے تعاون و

ستمبر کے اواخر تک نامزد عہدوں پر تقررات کئے جائیں گے: مہیش کمار گوڑ

80 فیصد عہدے پرانے اور وفادار قائدین کو اور 20 فیصد عہدے نوجوانوں کو مختص کرنے کا اعلان

حیدرآباد۔ صدر تلنگانہ پردیش کانگریس کمیٹی مہیش کمار گوڑ نے اعلان کیا ہیکہ ریاست میں زیرالتواء تمام نامزد عہدوں پر تقررات کا عمل ستمبر کے اواخر تک مکمل کر لیا جائے گا۔ انہوں نے واضح کیا کہ ان تقررات میں 70 سے 80 فیصد عہدے پارٹی کے پرانے مخلص اور وفادار قائدین کو دیئے جائیں گے جبکہ ماباقی 20 فیصد عہدے نئے اور باصلاحیت قائدین کو مختص کئے جائیں گے کیونکہ پارٹی کو نئے خون کی بھی ضرورت ہے۔ مہیش کمار گوڑ نے اعتراف کیا کہ ماضی میں عہدوں کی تقسیم میں کچھ غلطیاں ہوئی تھیں لیکن اب صرف ان لوگوں کو ترجیح دی جائے گی جو پارٹی کیلئے زمین پر محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کارکنوں کی انتھک محنت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان ہی کی بدولت کانگریس اقتدار میں آئی ہے۔ صدر تلنگانہ پردیش کانگریس کمیٹی نے بی آر ایس پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ لوٹ مار کرنا اور پھر منہ چھپانا بی آر ایس کی پرانی فطرت ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ فلاح و بہبود اور ترقیاتی کاموں میں آج تلنگانہ کا مقابلہ ملک کی کوئی دوسری ریاست نہیں کرسکتی اور عوام میں حکومت کے تئیں زبردست مثبت ماحول ہے۔ مہیش کمار گوڑ نے کانگریس کیڈر کو ہدایت دی کہ وہ حکومت کی فلاحی اسکیمات کو گھر گھر تک پہنچائیں اور کامل اعتماد ظاہر کیا اور کہا کہ آئندہ اسمبلی انتخابات میں 100 سے زائد اسمبلی حلقوں پر کامیابی حاصل کرتے ہوئے کانگریس دوبارہ اقتدار حاصل کرے گی۔ مہیش کمار گوڑ نے سابق چیف منسٹر کے سی آر پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ کے سی آر کے ارکان خاندان کی اراضیات کے معاملے میں تحقیقات جاری رکھی جائے گی۔ انہوں نے استفسار کیا کہ اتنی بھاری تعداد میں سینکڑوں ایکر اراضی کہاں سے آئی۔ اگر وہ اراضیات ان کی ہیں تو دستاویزات پیش کرنے کا چیلنج کیا

امبیڈکر سے UPI تک: سوال وہی، جواب دلیل سے

UCC ہو یا — UPI نعرے نہیں، دستاویز اور اثرات دیکھیے

بھارت کے بڑے سماجی کارکن، مفکر اور مصنف عرفان جامیاوالا نے اٹھایا بڑا سوال

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے 1951 میں جواہر لال نہرو کی کابینہ سے استعفیٰ کیوں دیا تھا؟ ایم۔ ایس۔ گولوالکر نے مسلمانوں اور ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں کیا کہا تھا؟ اور آج UCC سے UPI تک کی سیاست کو کس نظر سے سمجھا جائے؟ بھارت کے بڑے سماجی کارکن، مفکر اور مصنف عرفان جامیاوالا نے ان سوالات کو تاریخ، آئین اور موجودہ پالیسی کے تناظر میں اٹھاتے ہوئے کہا کہ جمہوریت میں کسی بھی مسئلے کو صرف نعروں یا سیاسی پروپیگنڈے کی بنیاد پر نہیں سمجھنا چاہیے۔ امبیڈکر کا استعفیٰ صرف ذاتی اختلاف کا نتیجہ نہیں تھا۔ ہندو کوڈ بل، سماجی اصلاحات، کابینہ کے طریق؟ کار اور کئی اہم پالیسی معاملات پر ان کے سنجیدہ اختلافات موجود تھے۔ گولوالکر کے بارے میں بھی سوشل میڈیا پر گردش کرنے والے دعووں کو بغیر اصل دستاویز کے قبول کرنے کے بجائے ان کی مستند تقاریر اور تاریخی پس منظر کو دیکھنا ضروری ہے۔ آج UCC پر بحث ہے تو سوال ہونا چاہیے: قانون کیا کہتا ہے، کن لوگوں پر اس کا اطلاق ہوگا اور اس کے عملی اثرات کیا ہوں گے؟ اسی طرح UPI کے معاملے میں پالیسی، فیس، چھوٹے تاجروں اور عام صارفین پر اثرات کو سمجھنا ضروری ہے۔ عرفان جامیاوالا کا کہنا ہے: ''سوال کسی ایک جماعت یا نظریے کے خلاف نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم تاریخ اور موجودہ حالات کو نعروں سے سمجھیں گے یا حقائق اور دلیل سے؟'' دستاویز پڑھیے، قانون دیکھیے، حقائق جانچیے، دونوں طرف کے دلائل سنیے اور پھر اپنا نتیجہ نکالیے۔ یہی جمہوریت کی اصل طاقت ہے۔

10 اگست: مسلمانوں کے لیے صرف ایک تاریخ نہیں، انصاف کا سوال

—عرفان جامی والا

10 اگست... 1950 ہندوستان آزاد ہو چکا تھا۔ آئین سازی کا عمل جاری تھا۔ ایک ایسے ہندوستان کا خواب دیکھا جا رہا تھا جہاں ہر شہری کو برابری، عزت اور انصاف حاصل ہو۔ لیکن اسی دور میں درج فہرست ذاتوں یعنی CastesScheduled کی آئینی شناخت کو مذہب سے جوڑنے والا ایک اہم فیصلہ سامنے آیا۔ 10 اگست 1950 کو Scheduled)Constitution Order(Castes جاری کیا گیا۔ اس کے پیراگراف 3 کے تحت اس وقت CasteScheduled کا آئینی درجہ ہندو مذہب سے وابستہ افراد تک محدود تھا۔ بعد میں سکھوں اور بدھ مت کے پیروکاروں کو بھی اس دائرے میں شامل کیا گیا، لیکن مسلمان اور عیسائی اس سے باہر رہے۔ یہیں سے ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کیا سماجی ناانصافی کا درد مذہب دیکھ کر بدل جاتا ہے؟ اگر ایک ہی سماجی اور ذات پات کے پس منظر سے تعلق رکھنے والا شخص ہندو ہو تو اسے CasteScheduled کا آئینی حق مل سکتا ہے، لیکن اسی سماجی پس منظر کا دوسرا شخص مسلمان ہونے کی وجہ سے اس حق سے محروم ہو جائے، تو کیا یہ برابری کے اصول کے مطابق ہے؟ یہی سوال آج مسلمان اٹھا رہے ہیں۔ ہم کسی کے حقوق چھیننا نہیں چاہتے۔ ہم کسی دوسرے طبقے کے ریزرویشن کے خلاف نہیں ہیں۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں — اگر محرومی سماجی ہے تو اس کا آئینی علاج مذہب کی بنیاد پر مختلف کیوں ہو؟ مسلمانوں کی بڑی تعداد تاریخی طور پر دستکاری، بنائی، زراعت، محنت مزدوری اور مختلف روایتی پیشوں سے وابستہ رہی ہے۔ مذہبی شناخت بدل جانے سے کسی انسان کی سماجی یا معاشی محرومی خود بخود ختم نہیں ہو جاتی۔ اسی لیے 10 اگست کو ''یوم سیاہ'' کے طور پر یاد کرنے کی آواز کو کسی مذہب کے خلاف آواز نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ سوال ہندوستان کے آئین سے ہے ایک سیکولر ملک میں سماجی انصاف کا حق بھی سیکولر بنیادوں پر کیوں نہیں دیا جا سکتا؟ نیشنل کمیشن فار ریلجس اینڈ لنگویسٹک مائناریٹیز نے بھی سفارش کی تھی کہ CasteScheduled کا درجہ مذہب سے الگ کیا جائے اور ان مسلم و عیسائی طبقات کو بھی اس دائرے میں شامل کیا جائے جو سماجی طور پر ان طبقات کے مساوی ہیں۔ یہ کسی خصوصی رعایت کا مطالبہ نہیں۔ یہ برابری کا مطالبہ ہے۔ یہ کسی ہندو، سکھ یا بدھ بھائی کے حق کے خلاف نہیں۔ یہ کسی مذہب کے خلاف نہیں۔ یہ صرف ایک سوال ہے انصاف کی بنیاد مذہب ہوگا یا سماجی حقیقت؟ 10 اگست ہمارے لیے نفرت کا دن نہیں۔ یہ یاد دہانی کا دن ہے۔ ان لاکھوں لوگوں کی یاد کا دن جنہوں نے نسلوں تک محنت کی، مگر سماجی سیڑھی پر برابر جگہ حاصل نہ کر سکے۔ ہماری جدوجہد کسی سے چھیننے کی جدوجہد نہیں۔ ہماری جدوجہد اپنا آئینی حق مانگنے کی جدوجہد ہے۔ ریزرویشن کو مذہب سے نہیں، سماجی محرومی اور آئینی انصاف کے اصول سے جوڑیے۔ مسلمانوں کی آواز کو ووٹ بینک نہ سمجھا جائے۔ اسے انصاف کی آواز سمجھا جائے۔ کیونکہ انصاف کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ محرومی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اور برابری کا حق بھی کسی مذہب کا محتاج نہیں ہونا چاہیے۔

عرفان جامی والا مفکر و سماجی کارکن

مساجد کے لیگل ڈاکیومنٹس پر توجہ دینا نئی مساجد کے تعمیر سے زیادہ ضروری

حیدرآباد، (راست) مولانا ڈاکٹر حافظ احسن بن محمد الحمومی القادری (امام و خطیب شاہی مسجد باغ عام) نے شاہی مسجد باغ عام میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بااعتماد، مضبوط اور مکمل انسان بناتی ہے۔ رسول اکرم? کی سیرت شریعت اسلامیہ کے ایک ایک حکم کی حفاظت کے لیے راہ نما ہے۔ جیسے ہم اپنے بچوں کی ہمہ وقت حفاظت کرتے ہیں؛ اسی طرح ہمیں یہ فکر ہونا چاہیے کہ ہماری شریعت کا کوئی ایک حکم بھی ٹوٹ نہ پائے۔ ہندوستان میں ہر روز مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی ہو رہی ہے اور ہماری سیکڑوں تنظیمیں نقصان ہونے کے بعد صرف مذمتی بیانات جاری کرتی ہیں لیکن نقصان ہونے سے پہلے کسی کو بھی فکر نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال رواں برس 21 اگست کو الہ? آباد ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ 'حجاب اسلام کا بنیادی حصہ نہیں' ہے۔ یہ فیصلہ ایک لڑکی کا عدالت سے رجوع ہونے کے بعد ا?تا ہے۔ اب سوال تمام مسلم تنظیموں سے یہ ہے کہ کیا ا?خر اسلام میں پردہ لازمی ہے یا نہیں؟ ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمانوں کی جانب سے یہ ثابت نہیں کیا گیا کہ پردہ ضروریات دین میں سے ہے۔ جب کہ مسلم خواتین میں بلا کسی مسلکی اختلاف کے چودہ سو سال سے پردہ کا اہتمام جاری ہے۔ اب مسلم پرسنل لا بورڈ کے پاس محض مذمتی بیان جاری کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ ایسے لوگ جو اسلام کی بنیادوں پر عدالتوں میں جا کر فیصلے صادر کرواتے ہیں؛ ان کے سلسلے میں پہلے سے ہماری پاس کس طرح کی تیاری ہے؟ مسلمانوں کی تمام تنظیمیں خاموش ہیں۔ اس کی دوسری مثال حیدرا?باد میں گستاخ رسول? ملعون گوشہ محل ایم ایل اے کا کیس ہے۔ اس نے 2022 میں حضور رسالت ما?ب? کی شان میں سخت ترین گستاخی کی، جس سے ہر مسلمان کا دل مجروح ہوتا ہے، اس ملعون پر پی ڈی ایکٹ لگایا گیا۔ لیکن کسی ملی تنظیم کو اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ عدالتی کاروائی کس طرح چل رہی ہے۔ کسی مسلم تنظیم نے اس کی پیروی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شکایت درج کرنے والے کو اپنا بنایا گیا۔ جس گستاخ نے گستاخی کی تھی؛ شکایت کنندہ سے بھی وہ گستاخی کرائی گئی اور یہاں تک کہلوایا گیا ہے کہ جس کے بارے میں شکایت کی گئی تھی، اس نے صحیح کہا ہے اور قرا?ن و حدیث کے مطابق کہا ہے۔ جن مسلم اداروں کو مٹھی بھر بھر کر چندے ملتے ہیں، ان میں سے کسی نے بھی پہل نہیں کی اور سب خاموش ہیں۔ بعض اوقات مجرم عدالتی کاروائی میں جھوٹ بول کر بری ہوتے ہیں۔ گواہوں کو پلٹایا جاتا ہے۔ یہ گستاخ رسول? اگر اپنی بات کہہ کر مکر جاتا یا جھوٹ بولتا تب تو بات کوئی اور تھی؛ لیکن ملعون نے اپنی بات پر اڑے رہ کر ان باتوں کا اقرار کیا ہے۔ کیا یہ پوری امت کا مسئلہ نہیں تھا؟ اب دینی جامعات کو اٹھ کر ا?گے ا?نا ہوگا کہ ان کا کام صرف طلاق، خلع اور حیض سے متعلق بتانا ہی نہیں ہے۔ ان مدارس کا مسئلہ صرف بورڈنگ میں پڑھنے والوں طلبہ کے کھانے تک محدود نہیں ہے۔ ان جامعات اور مدارس کا صرف یہ کام نہیں کہ دو دو ہاتھوں سے چندہ لیں اور خرچ کر دیں۔ ان سب کو امت پر ا?نے والے حالات کے سلسلے میں حساس اور ذمہ دار بننا ہوگا۔ بڑے بڑے چندے اور جائیدائیں مدارس اور جامعات کو اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ ناموس رسالت? اور اسلامی شریعت کی حفاظت کر سکے۔ عوام تو اسی مقصد اور منشا کے تحت دینی اداروں کا تعاون کرتی ہے۔ حجاب اور گستاخی رسالت ما?ب? کی یہ صرف حال کی دو مثالیں ہیں۔ مسلم وکلا برادری اور علما کے ساتھ پوری امت اس کی ذمہ دار ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے مفتیوں اور وکلا میں ا?پسی افہام و تفہیم ہو۔ ہماری پاس 27/7 ہمیشہ سرگرم ایک لیگل سیل ہونا چاہیے۔ جو ہمیشہ متحرک رہے۔ مولانا احسن الحمومی نے کہا کہ ا?ج مساجد کے بارے میں جس طرح کے حالات ہندوستان بھر میں رونما ہو رہے ہیں۔ اس پر میں گذشتہ ا?ٹھ برس سے توجہ دلا رہا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ نئی مساجد کی تعمیر سے زیادہ اپنی موجودہ مساجد کی حفاظت اور ان کا Legal Documentation ضروری ہے اور ا?ج کا یہ بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلم وکلا کی ایک ایسی ٹیم ہونا چاہیے کہ اگر کسی محلّہ کی مسجد پر خطرہ منڈلاتا ہو تو اس سے قبل وہ مسجد کی Legality کو ثابت کر سکے۔ جیسے ہم ختم قرا?ن پڑھنے والوں کو ا?سانی سے ڈھونڈ لیتے ہیں، اسی طرح ہمارے وکلاء ؁ کی ٹیم دستیاب ہو۔ یہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ مسلم وکلاء ؁ سال بھر اپنی پراکٹس کریں، ساتھ میں مساجد کی تحفظ کے لیے بھی کام کریں اور قانونی دستاویزات کی ایسی فہرست جاری کریں جو مسجد کو قانونی حیثیت کے سلسلے میں ضروری ہو۔ ہم سیاستدانوں سے بھی یہ بات دوٹوک انداز میں کریں کہ وہ ہماری مساجد کی حفاظت کے سلسلے میں ہمیں تیقن دیں۔

Editor Printer, Publisher & Owner by MOHD ATHER RAHEEM Published from FALAKNUMA NEWS Urdu Weekly 19-4-276/5/A Flat No 502.5th Floor Lakeview Residency,Baquar Nagar,BNK Colony,Miralam Tank Hyderabad 500 064. Printed at RIYAZ PRINTING PRESS #22-8-161 Behind Nayaab Hotel Chatta Bazar,Hyderabad-500002 Telangana.Head Office Contact No.04045375318,www.falaknumanews.in